معاہدۂ ہند

و

برطانیہ

ہندستان کے مستقبل پر ایک نظر

سر سید سلطان احمد

طبع اوّل اگست

قیمت ڈیڑ

سول ایجنٹس

نگارستان ایجنسی اردو بازار دلّی

ادارہ ہندستانی پبلشرز دلّی نے جیّد برقی پریس دلّی سے چھپوا کر شائع کیا

*

دیباچہ

ہندوستان اور برطانیہ کے تعلقات کو آنیوالے زمانے میں ایک عہد نامے کے تحت لانے کی تجویز سب سے پہلے سرکاری طور پر اس دستاویز میں کی گئی تھی جسے "کرپس کی تجویز" کہا جاتا ہے۔ اس میں یہ لکھا تھا کہ انگریزی سرکار اور اس دستور بنانے والی جماعت کے درمیان جو ہندوستان میں قائم کی جائے گی ایک عہدنامہ ہوگا جس میں "ان تمام سوالوں کی پہچان بین کی جائے گی جو انگریزوں کے ہاتھوں سے نکال کر پوری پوری ذمہ داری ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں دینے کی وجہ سے پیدا ہونگے"۔

ہندوستان کی دستوری ترقی کے لئے جن قاعدوں پر سوچ بچار کیا جا رہا ہے۔ ان میں اس نئی تجویز نے ایک بالکل انوکھی صورت پیدا کر دی ہے۔ عام طور پر جب کبھی کسی انگریزی نوآبادی کو سیاسی ترقی دے کر سوراجی حیثیت دی جاتی ہے تو انگریزی پارلیمنٹ اس مطلب کے لئے مختلف وقتوں میں دستوری اصلاحوں کے قانون بناتی ہے۔ مثلاً اگر ہندوستان کو ڈومی نین کا درجہ دینا ہو تو دستوری حیثیت سے جو کچھ ضروری ہوگا وہ صرف یہ کہ انگریزی پارلیمنٹ یہ قانون بنا دے گی کہ ہندوستان کے بارے میں آئندہ بادشاہ سلامت کو مشورہ دینے والے ہندوستانی وزیر ہونگے۔ جو ایک ہندوستانی پارلیمنٹ کے سامنے جواب دہ ہوں گے۔ اس تبدیلی کے لئے کسی عہدنامے کی ضرورت نہیں ہوگی۔

معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے بارے میں جو نیا قاعدہ تجویز کیا گیا ہے۔ اس کی وجہیں یہ ہیں:-

(الف) اعلان کا جو مسودہ سر اسٹیفورڈ کرپس لائے تھے۔ اس میں دیسی ریاستوں کا

بھی ذکر تھا۔ اور یہ لکھا تھا کہ انھیں بھی دستور بنانے والی جماعت میں اپنے "نمائندے مقرر کرنے" کی دعوت دی جائے گی، اور برطانوی ہندوستان کے صوبوں کی طرح انہیں بھی اس کا اختیار ہوگا کہ وہ چاہے نئے دستور پر قائم رہیں یا ان میں سے ہر ایک اپنی الگ الگ حیثیت قائم رکھے۔ ان میں سے ہر صورت میں ان کے عہدنامے تینوں پارٹیوں ــــ انگریزی سرکار۔ برطانوی ہندوستان اور خود دیسی ریاستوں ــ کی آپس کی بات چیت سے طے ہونا تھے :-

(ب) اب تک صرف انگریزی سلطنت کے اِنھی ملکوں کو ڈومی نین کا درجہ حاصل تھا جن کی آبادی زیادہ تر یورپی نسل کی ہے۔ ہندوستان، اگر وہ برطانوی کامن ویلتھ (دولت مشترکہ) کے اندر رہے، تو پہلی بڑی ایشیائی ریاست ہوگا جو اپنی مرضی سے ان آزاد قوموں کے جھرمٹ میں شامل ہو جائے گا جنہیں برطانوی کامن ویلتھ کہتے ہیں۔ ایسی صورت میں اس کے خاص حالات کو دیکھتے ہوئے خاص قاعدے قانون کی ضرورت ہوگی :-

(ج) اعلان کے مسودے میں اس صورت کا بھی خیال رکھا گیا تھا کہ شاید ہندوستان یونائیٹڈ کنگڈم کے ساتھ عہدنامے کی رو سے گہرے تعلقات رکھتے ہوئے بھی برطانوی کامن ویلتھ سے علیحدہ ہو جائے :-

(د) چونکہ عہدنامے کی تجویز برطانوی سرکار اور ہندوستان کی دستور بنانے والی جماعت کے درمیان کی گئی تھی۔ اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ شاید بعض اہم باتیں اس عہدنامے کے اندر نہ آتیں۔ مثلاً ہندوستان اور یونائیٹڈ کنگڈم کے آئندہ کے تعلقات۔ ظاہر ہے کہ ایسی اہم باتوں کے متعلق فیصلے کرنے کا حق دستور بنانے والی جماعت کو نہیں بلکہ اس نئی ہندوستانی حکومت کو پہنچنا چاہیئے۔ جو دستور بنانے والوں کی محنت اور چھان بین کے بعد پیدا ہوتی۔ کچھ لوگ کبھی کبھی یہ خیال کرتے ہیں کہ شاید اِن واقعات سے جو ۱۹۲۲ء کے آئرلینڈ کے عہدنامے کے "سلسلے میں" پیش آئے تھے ہندوستان کے مسئلہ پر بھی

روشنی پڑتی ہے۔ اصل میں ایسا نہیں ہے۔ آئرش فری اسٹیٹ کا قائم کرنا ایک نئے ہندوستانی دستور بنانے کے پاسنگ بھی نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس کی پوری آبادی شہر کلکتہ کی آبادی سے بھی کم ہے۔ اس کے علاوہ آئرلینڈ میں انگریزی سرکار کا معاملہ جن آدمیوں سے تھا۔ اُن میں آپس میں اتنا ایکا تھا کہ وہ کامیابی کے ساتھ ایک وقتی حکومت بنا سکتے اور چلا سکتے تھے۔ آئرلینڈ اور ہندوستان کے حالات میں یہ فرق بھی تھا کہ وہاں جو جھگڑا تھا وہ یونائیٹڈ کنگ ڈم کے دو حصوں کے درمیان تھا۔ دونوں ایک ہی دستور کے ماتحت تھے۔ اور ان کی علیحدگی میں قانونی پہلو صرف اتنا تھا کہ آئرش فری اسٹیٹ کو اس سیاسی سمبندھ سے جس کا وہ پہلے حصہ تھی کاٹ کر الگ کر دیا جائے۔

یہ سوال کہ عہدنامے کا طریقہ مناسب ہے یا نہیں — اب قریب قریب ختم سمجھنا چاہیئے۔ انگریزی سرکار مان چکی ہے کہ آگے چل کر ہندوستان کا مسئلہ اسی طریقہ سے طے ہوگا۔ اور ہندوستان اور انگلستان دونوں جگہ پبلک کی رائے بھی اب یہی ہے کہ آئندہ ایک عہدنامہ ہونا ہی پڑے گا۔

کرپس کے اعلان پر ہندوستان میں بہت زیادہ اعتراض ہو چکے ہیں اور اس مضمون میں ہم اس کی عام بھلائی برائی کی بحث چھیڑنا مناسب نہیں سمجھتے۔ اس سوال پر کہ کرپس کی تجویز ہندوستان کو سوراج کی طرف ایک قدم آگے بڑھانے کے لئے کافی ہے یا نہیں بہت زیادہ، بلکہ اُکتا دینے والی حد تک بحث مباحثہ ہو چکا ہے۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ کرپس کی تجویزوں کے کچھ پہلوؤں کی تو بہت زیادہ چھان بین ہوتی ہے۔ اور کچھ کی اتنی ہی کم۔ آنے والے زمانے میں ہندوستان کے بین الاقوامی تعلقات۔ اور اس کے بچاؤ کا سوال — یہ دونو چیزیں ہندوستان کے لئے حد درجہ اہم ہیں لیکن کرپس کے نقشہ سے یہ بالکل نہیں معلوم ہوتا کہ آئندہ ان کی صورت کیا ہوگی۔ ہندوستان اور یونائیٹڈ کنگ ڈم دونوں جگہ جو پبلک بحثیں ہوئیں ان میں

بھی اِن سوالوں پر کافی توجہ نہیں کی گئی اور نہ یہ غور کیا گیا کہ دونوں ملکوں کے تفصیلی سمجھوتے میں ان باتوں کی اہمیت کیا ہوگی ؛

اِن باتوں کی دو ایک مثالیں یہاں دی جاتی ہیں جن کے بارے میں کرپس کی تجاویز بالکل خاموش ہیں۔ مثلاً اِن تجاویز میں یہ کہیں نہیں بتایا گیا کہ جو دیسی ریاستیں یونین سے باہر رہنا چاہیں گی۔ ان کے حق کی حفاظت کیسے ہوگی اور ان کے بچاؤ کی ذمہ داری انگریزی سپاہ پر ہوگی یا یونین کی فوجوں پر۔ اسی طرح سے کرپس کے اعلان میں یہ نہیں بتایا گیا کہ ہندوستان اور اس کی ترکیبی ریاستوں کی حیثیت ان ملکوں کے مقابلہ میں کیا ہوگی جو اس کی خشکی کی سرحدوں سے ملے ہوئے واقع ہیں۔ نہ اس کا کوئی ذکر کیا گیا کہ ان ملکوں کے ساتھ ہندوستان کے آج کل کے تعلقات جو برطانوی سرکار کے واسطہ سے قائم ہیں آگے چل کر کس طرح براہِ راست بنائے جائیں گے۔ اعلان میں یہ بھی مذکور نہیں ہے کہ آئندہ دست درازی کی صورت میں ہندوستان اپنے آپ کو کیونکر بچائے گا۔ اور اس علاقے میں بین الاقوامی امن و امان قائم رکھنے میں اس کا حصہ کیا ہوگا ؛

ایک عہد نامے میں ہندوستان کی ان تمام ضرورتوں کا انتظام ضرور ہونا چاہیئے جو قوموں کے خاندان کے ایک ممبر ہونے کی حیثیت سے اسے پیش آئیں گی ہندوستان کے گھر کے جھگڑوں نے اس انتظام میں الجھاؤ پیدا کر دیا ہے۔ اس ملک کے سامنے سب سے بڑا سوال ہندو مسلم مسئلہ ہے۔ خواہ ایک ملک کی حیثیت سے ہو یا دو الگ الگ ریاستوں کی حیثیت سے ہندوستانی یونائیٹڈ کنگ ڈم کے ساتھ اسی صورت میں عہد نامہ کر سکتا ہے جب یہ اندرونی جھگڑا ختم ہو جائے اگرچہ یہ سوال ہندوستان کے لیڈروں کے حل کرنے کا ہے لیکن برطانیہ کو بھی چاہیئے کہ صرف دور سے کھڑے کھڑے تماشہ نہ دیکھے بلکہ اسے سلجھانے میں خود بھی حصہ لے

چاہے ہندوستانیوں کو اسے ماننے میں تامل اور رنج ہو لیکن واقعہ یہ ہے کہ اب معاملہ یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ پہل برطانیہ کی طرف سے ہونا ضروری ہے۔ اس پہل کے بغیر ہندوستانی مسئلہ سلجھ ہی نہیں سکتا اور جب تک یہ مسئلہ نہ سلجھے ہندوستان اور برطانیہ بین الاقوامی حیثیت سے ایک دوسرے کا ہاتھ نہیں بٹا سکتے۔ اور جب تک یہ نہ ہو بین الاقوامی سلامتی ہمیشہ خطرے میں رہے گی۔

آج ہندوستان کے لئے سب سے بڑی ضرورت اس کی ہے کہ یہاں ایک سچی دیش بھگتی، سچا حب وطن جنم لے۔ سوویٹ روس کے بعد ہندوستان ہی ایشیا کی سب سے بڑی آیندہ طاقت ہے۔ اس کا انتظام پائیدار اور اس کا عدالتی نظام مضبوط ہے۔ اس کی فوجی روایتیں شاندار ہیں۔ اس لڑائی کے بعد ہندوستانی فوج اتنی مضبوط ہوگی جتنی وہ شاید کبھی پہلے نہ ہوئی ہو گی۔ شہری آزادی کے خیالات اب ہمارے قومی تانے بانے میں اچھی طرح رچ پچ گئے ہیں۔ ہندوستان کو زبردست معاشی اور صنعتی موقعے حاصل ہیں۔ لیکن یہ موقعے اسی وقت پورے ہو سکتے ہیں جب پہلے وہ مذہبی جھگڑا جس نے ہماری سیاسیات میں بس بھر دیا ہے ختم ہو جائے۔ ابھی تک یہ آس باقی ہے کہ شاید اب بھی ہندوستان کو قومی ذمہ داریوں کا خیال پیدا ہو جائے۔ باہر کی طوفانی دنیا کے ساتھ نباہ کرنے میں جو خطرے ہیں انھیں سمجھ لیا جائے اور اس طرح قومی ایکا پیدا ہو جائے۔ اور اس ملک کے لوگ آپس میں مل کر ان جھگڑوں کو نبٹا سکیں جن میں آج انھوں نے اپنا سارا تن من پھنسا رکھا ہے۔ لیکن جو ساری سوجھ بوجھ رکھنے والوں کی نظر میں گھریلو جھگڑوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے:

ہندوستان کا نیا دستور بناتے وقت اگر یہ فرض کر لیا گیا کہ یہاں کے گھریلو اور بدیسی مسئلے ایک دوسرے سے الگ تھلگ ہیں۔ اور گھریلو واقعات کا

کوئی اثر ہندوستان کی زمینی اور سمندری سرحدوں کی سلامتی پر نہیں پڑے گا تو یاد رکھئے کہ ہندوستان کے لئے بڑا خطرہ پیدا ہو جائے گا۔ اور اس کے سوراج کی کامیابی کی امید بہت کم رہ جائے گی۔ مسلم ہندوستان پچھم کے مسلم ملکوں کے ساتھ تصوری ہمدردی رکھتا ہے۔ اور آثار بتار ہے ہیں کہ ہندو ہندوستان کو بھی شاید چین اور ہندوستان کی اتری پوربی سرحد کے ملکوں کے ساتھ ایسی ہی ہمدردی پیدا ہو جائے۔ اس کے علاوہ ہندوستان میں ایسے لوگ بھی بڑی گنتی میں موجود ہیں۔ اور ان کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ جو سوویٹ روس کے تصوروں کے ساتھ گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس جھتے کی وجہ سے ہندوستانی سماج میں جو دڑاڑ پڑ گئی ہے وہ فرقہ واری تقسیم کو کاٹتی ہوئی چلی جاتی ہے۔ اگر کسی اور وجہ سے نہ بھی ہو تو بھی اس ایک بات کو ہندوستانی سیاسیات کے طالب علم کو سوچنا سمجھنا چاہیئے کہ بین الاقوامی بچاؤ اور گھریلو مسئلوں میں کتنا گہرا تعلق ہے ؛

ان مسئلوں کو طے کرنا ، اور کرپس کی تجویزوں میں جو جگہ چھوٹ گئی ہے اسے بھرنا کوئی آسان بات نہیں ہے ــــ خاص کر اس وجہ سے کہ بڑی بڑی طاقتوں نے اب تک آپس میں یہ طے نہیں کیا ہے کہ ایشیا ، کی سلامتی کے لئے آگے چل کر کس قسم کا بین الاقوامی انتظام کیا جائے گا۔ اس وجہ سے ہندوستان کے لئے یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ آگے چل کر اُسے اپنے بچاؤ کے لیے کتنی فوجوں اور کتنے سامان کی ضرورت پڑے گی۔ پچھلے تین برس میں ہندوستان پر سمندر، اور خشکی دونوں طرف سے حملہ ہو چکا ہے اور اس کے کچھ شہروں پر ہوائی بم باری بھی ہو چکی ہے۔ ظاہر ہے کہ ہندوستان کے بچاؤ کی ہر تجویز میں ان تینوں قسم کے حملوں کا خیال رکھنا ہوگا۔ یعنی ہندوستان کے پاس اس کا اپنا اچھے قسم کا بیڑہ ، فوج ، اور ہوائی طاقت ہونی چاہیئے

بدقسمتی سے ہندوستان اپنے ڈومی نین درجہ کی شروع کی منزلوں میں یہ سب ذمہ داریاں اٹھانے کے لئے تیار نہ ہو سکے گا۔ اسے اپنے بچاؤ کے ایسے انتظام میں جس میں اسے باہر سے مدد لینے کی ضرورت نہ پڑے کچھ دیر لگے گی۔ اب تک ہندوستان یونائیٹڈ کنگ ڈم کامن ویلتھ اور خود اپنے ملے جُلے وسیلوں پر بھروسہ کرتا رہا ہے۔

غرض کہ درمیانی زمانہ میں ہندوستان کو اپنے سول (شہری) اور فوجی پروگرام کو پورا کرنے کے لئے باہر سے مدد لینے کی ضرورت ہوگی۔ اسے ایک بڑے تجارتی بیڑے اور سول ہوا بازی کے پورے پورے انتظام کی ضرورت ہوگی ہندوستان اور برطانیہ کے درمیان جو عہد نامہ بھی ہو اُس میں ان سب باتوں کے لئے مِل جُل کر کام کرنے کا طریقہ ڈھونڈھ نکالنا بہت اہم ہوگا ؛

آئندہ آنیوالے ابواب میں اس کی کوشش کی گئی ہے کہ آگے چل کر جو مسئلے حل کرنا ہیں۔ ان میں سے کچھ کی چھان بین کی جائے۔ امید کی جاتی ہے کہ اِن مسئلوں پر غور کرنے سے پڑھنے والوں کے دلوں میں یہ بات صاف ہو جائے گی کہ ہندوستان اور برطانیہ کے آئندہ آنیوالے تعلقات کس قسم اور کس حیثیت کے ہوں گے۔ اس مضمون کے آخر میں ہم نے یہ تجویز کی ہے کہ بادشاہ سلامت کی حکومت کو کچھ اعلان فوراً کر دینے چاہئیں۔ اور ہندوستان کا نیا دستور بنانے کے لئے جس انتظام کی ضرورت ہوگی اس کے بارے میں بھی کچھ تجویزیں بتائی گئی ہیں ؛

جو حل بتائے گئے ہیں وہ ایسے ہیں کہ ان کی بنیاد پر بات چیت کی جا سکے اور کہیں کہیں ان کی عبارت ایسی رکھی گئی ہے کہ اس سے بحث مباحثہ کو شہ ملے۔ کوئی شک نہیں کہ ہماری چھان بین میں کچھ ایسے کھانچے رہ گئے ہیں جنہیں بھرنے کی ضرورت ہوگی۔ اگر اس مضمون سے غور و فکر، سوچ بچار کا راستہ کھل جائے تو گویا اس کا مطلب پورا ہو گیا ؛

اس مضمون میں جو رائے ظاہر کی گئی ہے وہ لکھنے والے کی اپنی ذاتی رائے ہے۔ سرکاری اور خاص کر سرکار ہند کی رائے سے اسے کوئی لگاؤ نہیں ہے

پہلا باب

بچاؤ کے مسئلے

پچھلا زمانہ اور آج کل

دوسری سنساری لڑائی سے پہلے ہندوستان کے پاس ایک چھوٹی سی مستقل فوج اور لام بندی کی صورت میں مجروحین اور مقتولین کی جگہ بھرنے کے لئے ایک چھوٹا سا ریزرو (محفوظ حصہ) تھا۔ اس کی ہوائی طاقت کسی گنتی میں نہ تھی۔ اور شاہی ہندوستانی بیڑا نیا نیا بنا تھا۔ فوج کی تقسیم، میدانی فوج، حفاظتی فوج اور انڈین اکس پی ڈی شنری (مہماتی) فوج میں کی گئی تھی۔ حفاظتی فوج کا کام یہ تھا کہ ہندوستان کی خشکی کی سرحدوں پر حملہ ہونے کی صورت میں وہ اس وقت تک دشمن کو روکے رکھے جب تک میدانی فوج مقابلہ کے لئے تیار نہ ہو جائے۔ پچھلی لڑائی کے تجربے نے یہ بتا دیا تھا کہ شمال مغربی سرحد کے بچاؤ کی لائن مشرق وسطیٰ (مڈل ایسٹ) میں شروع ہوتی ہے، لیکن اس کا کسی کو سان گمان بھی نہ تھا کہ ہندوستانی فوج کو کبھی ایشیاء کے کسی لڑائی کے میدان میں کسی اعلیٰ درجہ کی کلدار فوج کا سامنا بھی کرنا ہوگا۔ اس لئے فوج کو کلدار سامان سے لیس کرنے پر بہت کم توجہ دی گئی تھی۔ جب جرمنی کی دوبارہ ہتھیار بندی سے یورپ کے لئے خطرہ کا امکان پریشان کن حد تک بڑھ گیا، تب ہندوستان

سے فوجی حاکموں کو یہ خیال آیا کہ ہندوستانی فوج کو کلدار بنانے کا پروگرام بھی شروع کرنا چاہیئے۔ اپنے سمندری بچاؤ کے لئے ہندوستان بالکل امپیریل (شہنشاہی) بیڑے کا محتاج تھا۔ ہوائی حملوں سے بچاؤ کی جو تدبیریں آج کل کی جاتی ہیں۔ ان کا یہاں کسی کو خیال بھی نہ تھا۔ ملکی امن و امان کا انتظام ہندوستان کی مختلف چھاؤنیوں میں فوج کو تقسیم کر کے کیا گیا تھا۔

جب موجودہ لڑائی کے زمانہ میں آزمائش کی گھڑی آئی تو معلوم ہوا کہ بچاؤ کے یہ سارے انتظامات ناکافی ہیں۔ اتنے زمانہ تک ایسے ناکافی انتظامات کو گوارا کرنے کی وجہ کچھ تو خود برطانیہ کی امن پسندی کی پالیسی تھی۔ اور کچھ یہ کہ سرکارِ ہند فوجی معاملات پر بہت زیادہ روپیہ خرچ کرنے کا الزام اپنے سر لینے کو تیار نہ تھی۔ ہندوستان کی طرح خود یونائیٹڈ کنگڈم (سلطنت متحدہ) میں انگریزی حکومت جبر اور زیادتی کے اس سیلاب کے خلاف جو ۱۹۳۰ء سے آنا شروع ہو گیا تھا، احتیاطی کارروائیوں کو آخر وقت تک ٹالتی رہی اور اس بارے میں اس نے جو بے بصیرتی اور جھوٹا اطمینان دکھایا اس پر آنے والے زمانہ کے تاریخ نویس تعجب کریں گے۔ ہندوستان کے بارے میں جو دلیل پیش کی جاتی تھی، اور جس میں تھوڑا بہت وزن ضرور تھا۔ وہ یہ تھی کہ ہندوستانی لیجسلیٹو اسمبلی (قانون ساز مجلس) میں بچاؤ کے اخراجات کو گھٹانے کے جو ہنگامے مچائے جاتے تھے ان کی وجہ سے ہندوستان کے بچاؤ میں کوئی اضافہ اور ترقی ممکن نہ تھی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ سرکار اگر چاہتی تو اس ہمدردی سے ضرور بجا طور پر فائدہ اٹھا سکتی تھی جو ہندوستان کے قومی حلقوں میں اسپین، چین اور حبشہ (ابے سی نیا) کی طرف سے پیدا ہو گئی تھی۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ جواہر لال نہرو کھلے بندوں فاشزم (فسطائیت) اور نازیت کو انسانی سلامتی اور ترقی کا دشمن بتا چکے تھے۔ اگر دوراندیشی کی پالسی سے کام لے کر ہندوستان

کی پبلک رائے کو تیار کیا جاتا، اور اسے سمجھا دیا جاتا کہ ہندوستان چاروں طرف کے حملوں سے اسی صورت میں بچایا جا سکتا ہے جب وہ اخلاقی اور سامانی حیثیت سے تیار ہو جائے۔ تو حکومت کو پبلک کی حمایت ضرور حاصل ہو جاتی، اور ان ہزاروں قیمتی جانوں کا نقصان نہ ہوتا جو صرف تیاری کی کمی کی وجہ سے اٹھانا پڑا ہے۔

ادھر جاپان "مہا پوربی ایشیا" کی فتح کے منصوبے بنا رہا تھا، جس میں ہندوستان بھی شامل تھا۔ روس کو جرمنی اور جاپان دونوں طرف سے اپنے بچاؤ کی تیاریوں کی فکر تھی، اور چین آپس میں ایکا کرنے اور اپنے بدیسی دشمن۔ جاپان۔ سے لڑنے میں لگا ہوا تھا۔ جرمن کارندے مشرق وسطیٰ کے ملکوں میں فساد کے بیج بو رہے تھے۔ ہٹلر اور جاپان کے جنگی کرتا دھرتا مل بھگت کر کے ایک ایسی زبردست 'قینچی چال' کا منصوبہ گانٹھ رہے تھے کہ ان کی فوجیں ہندوستان کو پوری طرح فوجی گھیرے میں لیتی ہوئی وسطی مشرق میں آن ملیں۔ ہندوستان کے دشمنوں کی کامیابی میں اتنی کسر رہ گئی تھی کہ اب اس پر غور کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی چال کا پٹ پڑنا کسی طرح معجزے سے کم نہ تھا۔

جن باتوں نے ہندوستان کو بچالیا وہ یہ تھیں :-

(الف) برطانیہ کی لڑائی میں انگریزوں کی فتح

(ب) مصر کا بچاؤ (اس لڑائی کے ایک نازک معرکے میں ایک ہندوستانی ڈویژن نے، ایک بکتر بند ڈویژن کی مدد سے حملہ کر کے مارشل گریزیانی کی کمان کے تین لاکھ سپاہیوں کی محوری فوج کو تباہ کیا) اور

(ج) ہندوستان کی یہ قابلیت کہ ڈنکرک سے لے کر ہانگ کانگ تک سلطنت کے بچاؤ کے مورچوں میں جہاں جہاں کھانچے پڑے اس نے ان میں سے تقریباً ہر ایک کو بھر دیا۔

ایک ایسی حالت سے شروع کرکے کہ جب اس کے پاس تقریباً کچھ بھی نہ تھا، ہندوستان نے لڑائی کے تیسرے سال تک بیس لاکھ آدمیوں کی والنٹیر (رضاکارانہ) فوج بھرتی کرلی تھی اور اسے (بھاری توپوں، ٹینکوں، ٹریکٹروں، لاریوں اور ہوائی جہازوں کو چھوڑکر) اور ہر طرح کے سامان سے لیس کردیا بلکہ متحدہ قوموں کی فوجوں کے لئے سامان کی تیاری میں بھی خاصا حصہ لیا۔ ہندوستان کی جنگ کے زمانہ کی صنعتیں امید سے کہیں بڑھ چڑھ کر پھیل گئیں۔ اور اب تک برابر ایسی گہما گہمی سے کام کررہی ہیں جس کا کسی دوسرے زمانہ میں مشکل سے یقین آتا۔ رفتہ رفتہ ہندوستانی ایرفورس (ہوائی فوج) کو بھی نئی نئی مشینیں مل گئیں، اور ہندوستان کے محدود صنعتی وسیلوں کو دیکھتے ہوئے، شاہی ہندوستانی بیڑا بھی ایک اچھی خاصی طاقت کا مالک ہوگیا۔ ہندوستانی رجمنٹوں کے پرچموں پر بصرہ، بغداد، طہران، دمشق، بن غازی، انا ملاغی، تونس، اٹلی اور برما کے نام ہمیشہ روشن رہیں گے۔ جب اس لڑائی کی تاریخ لکھی جائے گی، تو ہانگ کانگ، سنگاپور، اور ملایا کی مصیبتوں کی داستانوں کے ساتھ ساتھ، ایک دردناک لیکن روشن پہلو کے طور پر ان سورماؤں کی کہانیاں بھی ہوں گی جنھوں نے اپنے کسی قصور یا کوتاہی کی بنا پر نہیں بلکہ انتہائی مجبوری اور مایوس کردینے والے حالات میں بہادری کے کارنامے دکھائے۔ مشرق بعید میں جو شکستیں ہوئیں ان کی کسر اب ہندوستانی فوجیں اپنے ٹھوس کارناموں سے برما اور اٹلی میں پوری کررہی ہیں۔ خود وزیر اعظم نے چوتھی، پانچویں اور آٹھویں ہندوستانی ڈویژنوں اور برما کے مورچہ والی چودھویں فوج کی بڑے موٹے لفظوں میں تعریف کی ہے۔ ہندوستانی ہوائی فورس نے، باوجود اس کے کہ ایک زمانہ میں اس کے پاس امریکی اور آر۔ اے۔ ایف کے ہوا بازوں

کے مقابلہ میں گھٹیا درجہ کی مشینیں تھیں۔ ہندوستان کے ساحلی بچاؤ میں اور برما میں جاپانیوں کے خلاف تعریف کے قابل کام کئے ہیں۔ شاہی ہندوستانی بیڑے نے بحرِ عرب کے راستوں کو دشمن سے صاف رکھا ہے اور جہازی قافلوں کی حفاظت میں پوری طرح مدد دی ہے۔ ریلوے ٹرک، ویگنیں اور انجن ہندوستان سے مشرقِ وسطیٰ کو بھیجے گئے ہیں، اور ۱۹۴۴ء کے وسط تک ہندوستان پہلی مرتبہ اس قابل ہوا کہ ان جاپانی فوجوں کو جو اس کی پوربی سرحد پر حملے کی کوشش میں تھیں بری طرح شکست دے۔

آئیوالے زمانہ میں ہندوستان کا بچاؤ

اس لڑائی سے پہلے یہ خیال کیا جا سکتا تھا کہ شمال اور شمال مشرق کی طرف سے ہندوستان پر حملوں کو روکنے میں ہمالیہ پہاڑ ایک زبردست دیوار کا کام دے گا۔ اسی لئے ہندوستان کو شمال مغربی سرحد اور سمندر کی طرف سے بچانے کی تدبیروں پر غور کیا جاتا رہا۔ پچھلے زمانہ میں ہندوستان پر جتنے حملے ہوئے وہ قریب قریب سب کے سب شمال مغرب سے ہوئے۔ یورپین حملہ آور البتہ سمندری راستہ سے آئے۔ یہی وجہ ہے کہ شمال مغربی سرحد کی حفاظت کے لئے ہندوستان کی چھوٹی سی فوج کافی سمجھی گئی، اور اپنے سمندری ساحلوں کی حفاظت کے لئے ہمارا ملک شاہی جہازی بیڑے کو ایک معمولی سی نقد رقم دے کر مگن بیٹھا رہا۔ اس کے پاس کوئی تجارتی بیڑہ نہ تھا اور وہ اپنا ذاتی بڑا بیڑہ رکھنے کے قابل ہی نہ تھا۔

آج کل کی لڑائی میں بہت سے نئے اور صاف صاف واقعات ایسے ظاہر ہوئے ہیں جنہیں ہندوستان کے آئندہ بچاؤ کے سلسلے میں نظر کے سامنے رکھنا ہوگا۔ انھیں فوجی جغرافیہ کے واقعات کی حیثیت سے پیش کیا جا سکتا ہے

فوجی امکانات کے اس بیان سے ہمارا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ہم کو اپنے پڑوسی ملکوں کی نیت پر کوئی شبہ ہے +

(الف) سنگاپور کے ہاتھ سے نکلجانے کی وجہ سے اب ہندوستان کے ساحلوں کو سمندری راستہ سے ملے جُلے ہوائی اور سمندری حملے کا خطرہ پیدا ہوگیا ہے اسی لئے اب مشرق میں ملایا، سیام، انڈوچائنا (ہندچین) اور برما ہندوستان کے لئے اتنے ہی اہم حلقے بن گئے ہیں۔ جیسے کہ مغرب میں ایران اور افغانستان کیمراہنہ کھاڑی میں ایک دشمن طاقت کی موجودگی ہندوستان کے لئے اتنی ہی خطرناک ہوگی جتنی کہ خلیج فارس میں۔ بنکاک کے واقعات اب ہندوستان کے لئے اتنی ہی اہمیت اور دلچسپی رکھتے ہیں جتنے کہ بصرہ کے واقعات +

(ب) ہندوستان کی اتری پوربی سرحد اب خشکی کے راستہ حملے سے محفوظ نہیں رہی ہے +

(ج) ہمالیہ کی "پشت کوہ" جس کے اوپر سے اب ہوائی جہازوں کے ذریعہ چین کو رسد جارہی ہے، چین کے اڈوں سے اڑکر آنیوالی مضبوط ہوائی طاقت کو ہندوستانی شہروں پر بمباری سے نہیں روک سکتی +

(د) شمال مغربی سرحد کا بچاؤ اصل میں وسطی مشرق سے شروع ہوتا ہے عدن گویا ہندوستان کا جبرالٹر ہے اور خلیج فارس اور نہر سوئز کی حفاظت سمندری حملہ سے ہندوستان کی سلامتی کے لئے حد درجہ اہم ہے۔

(ھ) ہندوستان کی شمالی سرحدوں پر طیارہ گاہوں کے لمبے سلسلے کی وجہ سے اس ملک کے شمالی شہروں کو بمباری کا خطرہ پیدا ہوگیا ہے۔ اور پنجاب پر ہوائی راستہ سے حملہ آسان ہوگیا ہے۔ اگر جرمن قفقاز (کاکیسس) پار کر لیتے یا روس ہار جاتا تو ہندوستان کی شمالی اور شمال مغربی سرحد کا بچاؤ بڑا مشکل

کام ہو جاتا۔

(۹) بحرِ ہند پر قابو رکھنا ہندوستان کی سلامتی کے لئے حد درجہ ضروری ہے۔

یہ تھیں فوجی ضروریات (اور جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں ان کے بیان کرنے سے ہمارا یہ مطلب نہیں ہے، کہ ہم اپنے کسی پڑوسی ملک کی نیت ہندوستان کے بارے میں مخالفانہ سمجھتے ہیں)، لیکن کسی ملک کے بچاؤ میں سیاسیات کا بھی اتنا ہی لگاؤ ہے جتنا کہ ہتھیاروں کا۔ یہ سوال کہ ملک کے بچاؤ کے لئے کتنی فوجی طاقت کی ضرورت ہوگی اس پر منحصر ہے کہ اس کے سیاسی رشتے کتنے اثر والے ہیں، اور ان کا رُخ کیا ہے، اس لئے ہندوستان کے بچاؤ کی تدبیریں سوچتے، اور اس ملک کے سیاسی ڈھچر کو ان کے ساتھ ربط دیتے وقت ہمیں اپنی توجہ ہندوستان کی سرحد پار پھیرنی چاہیئے، اور چاہے عارضی اور قیاسی ہی کیوں نہ ہو، تھوڑا بہت اندازہ لگانا چاہیئے کہ آنے والے دس، بیس سال میں مختلف دوستوں میں آپس میں کون کون سے نئے مجموعے اور جوڑ توڑ بنیں گے۔ آئندہ کے امکانات کے بارے میں شاید ذیل کے اندازے کچھ زیادہ بے جا اور نامناسب نہ ہوں گے:۔

(الف) اس لڑائی کے بعد روس یورپ اور ایشیا دونوں ملکوں کی سب سے بڑی فوجی طاقت ہوگا۔ جاپان کی ہار سے اور ایک فوجی طاقت کی حیثیت سے۔ چاہے وہ تھوڑے ہی زمانے کے لئے کیوں نہ ہو۔ جاپان کے مٹ جانے کی وجہ سے روس کی پوربی سرحدیں محفوظ ہو جائیں گی۔ دکھنی سرحدوں پر روس کے پاس بحرِ اسود (بلیک سی) سے لے کر سنکیانگ تک نہایت محفوظ فوجی اور ہوائی اڈوں کا ایک سلسلہ ہوگا۔ خلیج فارس (پرشین گلف) تک روس کو پہلے ہی راستہ مل گیا ہے اور آئندہ بحرِ اسود کا راستہ بھی اس پر پوری طرح بند نہیں

کیا جاسکے گا۔

(ب) اسی طرح، جاپان کی شکست کی وجہ سے چین کو بھی فوجی فائدے حاصل ہوں گے۔ چین کا مستقبل ابھی تک دُھندلا ہے، اور ایسے رائے کار بہت کم ہیں جو یہ سمجھتے ہوں کہ لڑائی کے بعد چین کی مصیبتیں ختم ہو جائیں گی، یا یہ کہ کومن ٹانگ اور کمیونسٹوں (اشتراکیوں) کے افسوس ناک جھگڑے آسانی سے نبٹ جائیں گے، لیکن اس میں شبہ کی بہت کم گنجائش ہے کہ ایک زمانہ گزرنے کے بعد چین ایک طاقتور اور بڑا ملک بن جائے گا۔ بلکہ شاید ابتری اور فساد کے دَور سے کامیابی کے ساتھ گزر جانے کی وجہ سے چین کی سلطنت آگے چل کر فوجی رنگ کی ہو جائے۔ یہ لازمی بات ہے کہ لڑائی کے بعد چین کی بحالی کے پروگرام میں زبردست فوجوں کا انتظام ضرور شامل ہو گا۔ اگر کسی اور وجہ سے نہیں تو کم از کم اس لئے ایسا ہونا ضروری ہے کہ جاپانیوں کی دراز دستی سے جو مصیبت اِس ملک نے اٹھائی ہے وہ اُسے آئندہ نہ اٹھانی پڑے۔

(ج) پس یہ امید کی جاسکتی ہے کہ روس اور چین دونوں ملکر ایشیا کے شمالی آدھے حصہ کے بچاؤ کے انتظامات اپنے ہاتھ میں لے لیں گے۔ ایک طرف تو یہ زبردست فوجی ڈھیر ہو گا اور اس کے مقابلہ میں ایشیا کا جنوبی آدھا حصہ اختلافات بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ "تبلقانیت" کا شکار رہے گا۔ یہ اور بات ہے کہ ہندوستان اپنے اثر سے تھوڑا بہت تال میل اور ایکا باقی رکھے۔ جنوبی ایشیا کا یا یوں کہنا چاہیئے کہ بحرِ ہند (ہند ساگر) کے علاقہ کا جو خاص سیاسی ڈھانچہ ہے باہر کی دنیا نے اس کا بہت کم مطالعہ کیا ہے اور اس کی وجہ سے امن و امان کو جو خطرہ ہے اسے بہت کم سمجھا ہے۔ ہندوستان کو چھوڑ کر ایشیا کے جنوبی آدھے حصے کے سب ملک بہت چھوٹے اور ان کی فوجی حیثیت بہت کمزور ہے جغرافیائی حیثیت سے

دیکھیے تو مختلف جزیرہ نما ؤں اور جزیروں کی نقشہ بندی کی وجہ سے ان ملکوں کے بچاؤ کا مسئلہ پیچیدہ ہوگیا ہے۔ اِس علاقہ کی آئندہ زندگی کا دار و مدار سمندری بچاؤ پر ہوگا۔ اس لئے جب تک بڑے پیمانہ پر ساری دنیا میں ہتھیاروں میں کمی نہ ہو ہندوستان کو اپنی سلامتی کے لئے، اور جس علاقہ میں وہ واقع ہے اس کے امن و امان کے لئے اس کی ضرورت ہوگی کہ یا تو خود اپنی اعلیٰ درجہ کی نئے قسم کی فوجی مشینری ایک مضبوط ہوائی بیڑہ، شہری ہوا بازی کا نظام اور ایک کافی سمندری بیڑہ رکھے، یا پھر کسی دوسرے ملک سے ان باتوں کی امداد حاصل کرے۔

یہ بات تو ظاہر ہے کہ ہندوستان اکیلا جنوبی ایشیا کے وسیع علاقوں کے بچاؤ کا ذمہ نہیں لے سکتا، اور نہ ہندوستان یہ کرسکتا ہے کہ زمانہ کے چلن کے خلاف اپنے چھوٹے چھوٹے ہمسایہ ملکوں پر زبردستی اپنا حفاظتی راج قائم کرے لیکن ایک بڑی طاقت' یا ہونے والی بڑی طاقت کی حیثیت سے ہندوستان کے اوپر بھی کچھ ذمہ داریاں ہیں۔ اور دنیا کی سلامتی کے عام نظام میں اسے ضرور حصہ لینا چاہیئے۔ ہندوستان کے لئے جو انتظام تجویز کیا جائے گا وہ شاید یہ ہوگا کہ وہ "برطانیہ ڈومی نیون" (نوآبادیات) اور شاید کسی حد تک امریکہ کے ساتھ مل کر عدن اور سنگا پور کے بیچ کے علاقہ کے امن و امان کی کچھ ذمہ داریاں قبول کرے۔

ایشیا کے شمال اور جنوب کے آدھے آدھے حصوں میں فوجی قوتوں کی نئی ترتیب سے یہ لازم آتا ہے کہ فوجی معنوں میں یہ دونوں حصے ایک دوسرے کا پلّہ برابر رکھیں۔ آج کل کے خیالات کا رخ بتا رہا ہے کہ آئندہ علاقہ داری سلامتی کے ایسے نظام کو زیادہ پسند کیا جائے گا جس میں کسی ایک ملک کو ضرورت سے زیادہ بڑی فوجیں نہ رکھنی پڑیں۔ لیکن پچھلی لڑائی اور موجودہ زمانہ کے بیچ میں جو ڈ

گزرا ہے اس کا تجربہ بتاتا ہے کہ دُنیا کی سلامتی، خصوصاً چھوٹے ملکوں کی سلامتی کا سوال ہتھیاروں کی عام کمی سے حل نہ ہوگا۔ بہت ممکن ہے کہ ایشیا کے برِاعظم میں فوجوں کی نئی ترتیب کا نتیجہ یہ نکلے کہ شمالی آدھے حصّے کی سلامتی تو چین اور روس کے ذمہ کردی جائے، اور چونکہ ہندوستان برطانوی کامن ویلتھ (دولت مشترکہ) کا ممبر ہے، اور اس وجہ سے ایک خاص طاقت کا مالک ہوگا، اس لئے جنوبی آدھے حصے کی ذمہ داری اسے سونپ دی جائے۔ کوئی وجہ نہیں ہے کہ یہ دونوں علاقوں دار نظام ایک دوسرے کے ساتھ تال میل کیوں نہ رکھیں اور ایک سے دوسرے کو مدد کیوں نہ ملے۔ آپس کے اس تال میل کا قدرتی طور پر یہ نتیجہ ہوگا کہ پورے براعظم کے لئے جو فوجیں ضروری ہوں گی ان میں کفایت ہو سکے گی۔ اور عام فائدہ کی خاطر ہر ملک کو جو بوجھ اٹھانا پڑے گا اس میں بھی کچھ کمی ہو جائے گی۔ اور پھر اس انتظام سے بڑی دولتوں کو چھوٹی دولتوں پر کوئی ناجائز برتری بھی حاصل نہ ہو سکے گی بلکہ اگر دیکھا جائے تو چھوٹی بااقتدار ریاستوں کی حفاظت اور بچاؤ کا ضامن صرف اسی قسم کا نظام ہو سکتا ہے۔

حالات کی اس چھان بین میں یہ اندازہ لگانے کی کوشش نہیں کی گئی ہے کہ ہندوستان کو اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے کے لئے کتنی فوجی قوت کی ضرورت ہوگی۔ قدرتی طور پر یہ سوال فوجی ماہروں کے سوچنے کا ہے۔ ہمیں جن چیزوں سے تعلق ہے وہ یہ ہیں:۔

(الف) یہ بتا دیا جائے کہ تمام ایشیائی ملک اپنی عام سلامتی کے لئے ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔

(ب) یہ ثابت کر دیا جائے کہ جب تک ہندوستان مضبوط اور اندرونی طور پر متحد نہ ہوگا وہ ایشیا کی سلامتی کے بارے میں اپنی ذمہ داری پوری نہ کر سکے گا

(ج) یہ بتا دیا جائے کہ اگر ہندوستان سولہ آنے خود اپنی طاقت پر بھروسہ نہ بھی کرے بلکہ کامن ویلتھ (دولت مشترکہ) میں شامل رہے تو بھی اسے اپنے بچاؤ کی ضرورتوں کے لئے صنعتی ترقی کے ایک بہت بڑے پروگرام پر عمل کرنا ہوگا جس میں جہاز، ریلوے انجن، موٹر کار اور ہوائی جہاز بنانے کے کارخانے بھی شامل ہوں گے۔ امن کے زمانے کی صنعتوں کا انتظام اس طرح کرنا ہوگا کہ اس سے نہ صرف ضرورت پڑنے پر جنگی سامان کی تیاری کا کام لیا جا سکے بلکہ انہیں باہر کے حملوں سے بھی بچایا جا سکے۔

(د) یہ بتا دیا جائے کہ ہوائی اور سمندری بچاؤ کے سلسلہ میں ہندوستان اور سلطنت متحدہ (یونائیٹڈ کنگڈم)، ہندوستان اور آسٹریلیا، اور ہندوستان اور جنوبی افریقہ کے درمیان گہرے تعاون کی ضرورت ہے، اور

(ھ) اس بات کو تاکید کے ساتھ بیان کر دیا جائے کہ ہندوستان کی ڈومینین اور سلطنت متحدہ (یونائیٹڈ کنگڈم) کے درمیان جو عہدنامہ بھی ہو اس میں بچاؤ کے مشترکہ مسائل لازمی طور پر شامل ہونے چاہئیں۔

اوپر کے فقروں میں جو دلیلیں پیش کی گئی ہیں ان کی بنا پر بہت ممکن ہے کہ یہ سمجھ لیا جائے کہ ہندوستان ہتھیاربندی کا ایک ایسا پروگرام شروع کرنے والا ہے جس سے وہ خود آگے چل کر ایک دست درازا ور سامراجی قوم بن جائے گا۔ جو لوگ ہندوستان کے باشندوں اور ان کے تصوراتی مقصدوں سے واقف ہیں وہ اس قسم کے شبہوں کو ہرگز اپنے دل میں جگہ نہ دیں گے۔ ہندوستان ایک امن پسند ملک ہے۔ امن اور شانتی کا پرچار سدا سے اس دیس کی روایت ہے۔ اگر ہندوستان اپنی آنکھوں سے جاپان اور جرمنی کی غارت گری کو نہ دیکھ چکا ہوتا تو ضرور اس کا رجحان تخفیف اسلحہ کی طرف ہوتا لیکن جنگ کے بعد کے دور میں جو یقیناً امن اور سکون کا دور نہ ہوگا، یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ ہندوستان اپنے کو جوکھم میں ڈال دے اور

اپنی سلامتی کا اتنا خیال بھی نہ کرے جتنا کہ دوسری بڑی دولتوں کو ہے پس ہندوستان کی پالسی یہ ہوگی کہ اپنے اثر سے کام لے کر ہتھیاروں کی تخفیف کرے اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ ہر ایسے نظام کی حمایت کرے جس سے عام سلامتی کی آس بندھتی ہو۔ اس کے لئے جیسا کہ اب عام طور پر سمجھ لیا گیا ہے، امن پسند دولتوں کے ہاتھوں میں بھی کچھ نہ کچھ موثر فوجی طاقت کا ہونا ضروری ہوگا۔ باقی رہا یہ سوال کہ سلطنت متحدہ اور ہندوستان کے آئندہ تعلقات کیا ہوں، اس مسئلے پر ٹائمز نے اپنی ۲۴ اگست ۱۹۴۷ء کی اشاعت میں نہایت قابل تعریف پیرایہ میں اپنی رائے یوں ظاہر کی ہے:۔

"ہندوستان کے بارے میں جس پالسی کا اعلان برطانیہ کی طرف سے کیا جا چکا ہے اس کی کامیابی متحدہ اقوام کے لئے حد درجہ اہم ہے۔ ہندوستان پر اس کے قدرتی وسائل اور جغرافیائی حالات کی وجہ سے دنیاوی نظام میں بین الاقوامی حیثیت سے حصہ لینے کی جو ذمہ داری عاید ہوتی ہے وہ اُسے صرف اسی صورت میں پورا کر سکتا ہے کہ یہ پالسی کامیاب ہو۔ ہندوستان کو بھاری ذمہ داریاں اٹھانی ہوں گی۔ جنوب مشرقی ایشیا کی سب سے بڑی طاقت بننے کی جو صلاحیتیں ہندوستان میں موجود ہیں ان کی وجہ سے اس علاقہ کو آئندہ دست درازی سے بچانے میں ہندوستان کا حصہ ناگزیر ہوگا۔ .... آئندہ چل کر ہندوستان اور برطانیہ کے جو تعلقات بھی ہوں مہذب دنیا کے مفاد کا تقاضا یہ ہے کہ ان تعلقات کی بنیاد بھی شراکت پر ہو۔ یہ بات روز روشن کی طرح ظاہر ہے کہ اگر اس وقت برطانوی اور ہندوستانی مدبر ایک دوسرے سے الگ تھلگ رہے تو ہندوستان کی مشکلیں حل

نہ ہو سکیں گی، برطانیہ کی نیت چاہے کتنی نیک ہو لیکن صرف اسی سے کام نہ بنے گا۔ اور آگے چل کر ہندوستان کی آزادی کتنی ہی مکمل کیوں نہ ہو ہندوستان کو اس کی ضرورت ہے اور اسے حق پہونچتا ہے کہ وہ برطانیہ سے کہے کہ آؤ اور ہمارے گھر کی حالت سدھارو۔ سچی ترقی کے لئے دو باتیں ضروری ہیں پہلی بات تو یہ کہ ہر فریق دوسرے فریق کی مشکلات سمجھنے پر آمادہ ہو، اور دوسرے یہ کہ وسیع تر مفاد کو محض کسی شخصی، فرقہ واری، یا قومی وقار کی خاطر پسِ پشت نہ ڈال دیا جائے۔

دوسرا باب

بین الاقوامی ملاحظات

محکمہ اُمور خارجہ

باہر کے ملکوں کے ساتھ ہندوستان کے تعلقات اب تک زیادہ تر لندن کے دفتر خارجہ کی عام ہدایت اور نگرانی میں طے پاتے ہیں بدیسی ملکوں میں بادشاہ سلامت کی حکومت کے نمائندے ہندوستان کے مفاد کی بھی دیکھ بھال کرتے ہیں

لیکن ساتھ ہی سرکار ہند کے محکمہ امور خارجہ کے کام اور اس کی اہمیت میں بھی برابر اضافہ ہوتا رہا ہے۔ شروع شروع میں اس محکمہ کا کام شمال مغربی سرحد کے مقامی انتظامی اداروں اور بلوچستان کی دیکھ بھال، اور قبائلی علاقوں اور سرحدی ریاستوں سے متعلق تھا لیکن اب اس قسم کا کام پھیل گیا ہے۔ یہ پھیلاؤ اس وقت سے شروع ہوا جب پہلی عالمگیر لڑائی کے بعد افغانستان اور نیپال پوری طرح خودمختار ریاستیں بن گئیں، اور ان ملکوں کے لئے انگریزی نمائندوں کا انتخاب اس سروس کے ممبروں میں سے ہوتا رہا جسے اب انڈین پولیٹیکل سروس کہتے ہیں ان دونوں ملکوں اور برطانیہ کے تعلقات کو ہندوستان کے خارجی تعلقات کی حیثیت سے دیکھنے کا رجحان حال میں نمایاں ہوا ہے۔ آج کل کی لڑائی نے سرکار ہند کو یہ

سمجھا دیا ہے کہ اب وہ اپنی نظریں اپنی قریبی سرحدوں اور اپنے قریبی ہمسایوں سے اور آگے بڑھائے۔ چین امریکہ اور روس ہندوستان کے اتحادی بن گئے، ان کے اور ہندوستان کے درمیان معاشی کڑیاں مضبوط ہو گئیں۔ لڑائی کے مختلف میدانوں میں ہندوستانی فوجوں کے بھیجے جانے کی وجہ سے نئے تعلقات پیدا ہوئے اور نئے مسئلے وجود میں آئے۔ اب آج کل سرکار ہند امریکہ اور چین کی حکومتوں کے ساتھ براہ راست سفارتی تعلقات رکھتی ہے اور شاید جلد ہی وسطی مشرق اور جنوب مشرقی ایشیا کے ملکوں کے ساتھ بھی ایسے ہی تعلقات قائم ہو جائیں گے۔ اس کے علاوہ اب ہندوستان اپنے ہائی کمشنر مختلف ڈومینینوں (نوآبادیات) میں مقرر کر رہا ہے، اگرچہ ان کے ساتھ ہندوستان کے تعلقات محکمہ امور خارجہ کی بجائے محکمہ تعلقات دولت مشترکہ (کامن ویلتھ ریلیشنز ڈیپارٹمنٹ) کی نگرانی میں ہیں۔

امور خارجہ کا موجودہ محکمہ پرانے محکمہ سیاسیہ و خارجہ (فارن اینڈ پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ) کی ایک شاخ ہے جو امور خارجہ اور دیسی ریاستوں دونوں کے معاملات کی دیکھ بھال کے لئے قائم ہوا تھا۔ ۱۹۳۵ء کے قانون کی رو سے دیسی ریاستوں سے متعلق مسئلے گورنر جنرل باجلاس کونسل کی اختیاری حدوں سے نکال لئے گئے اور اب نمائندہ تاج کی ذمہ داری میں آ گئے ہیں جس کا عہدہ گورنر جنرل کے عہدے سے الگ کر دیا گیا ہے۔ محکمہ سیاسیات (پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ) کے نام سے ایک الگ محکمہ بنا دیا گیا ہے۔ جو نمائندہ تاج کے ماتحت ہے، اور محکمہ امور خارجہ کا قلمدان وائسرائے کے پاس ہے۔ ان دونوں محکموں کے افسر انڈین پولیٹیکل سروس کے آدمی ہوتے ہیں جس میں اب تدریجی طور پر ہندوستانیوں ہی کے تقررات ہو رہے ہیں +

محکمہ امور خارجہ کا کام یہ ہے کہ بادشاہ سلامت کی حکومت کو ہندوستان

کے خارجی معاملات اور ضرورتوں کے بارے میں صلاح مشورہ دے۔ جب سے ہندوستان کو لڑائی کے بعد ڈومی نین کا درجہ دینے کا وعدہ ہوا ہے اس محکمہ کی سرگرمیاں اور ذمہ داریاں آئے دن بڑھتی جارہی ہیں اس کا کام کچھ اس طرح رہ رہ کے اور بے تکے پن کے ساتھ پھیلا ہے کہ اب باہر کے ملکوں میں ہندوستان کے خاص معاملات کا مکمل جائزہ لینا ضروری ہوگیا ہے۔ خارجی معاملات میں بادشاہ سلامت کی حکومت اور سرکار ہند کے درمیان جو اشتراک مفاد آج کل موجود ہے اس میں ابھی کافی عرصہ تک خلل نہ پڑنا چاہیئے، ورنہ ہندوستان کے خارجی تعلقات میں ابتری پیدا ہوجانے کا اندیشہ ہے۔ اگر ہندوستان کو آئندہ بادشاہ سلامت کی حکومت کی سفارتی مصلحت (ڈپلومیسی) کا ساتھ دینا ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ اپنے ذاتی مفاد کے لئے بھی جو پالیسی بنائی جائے اس میں بھی برطانیہ کے دفتر خارجہ کے وسیع اور کئی برس کے تجربے سے فائدہ اٹھائے۔ اس سے بھی زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ نوجوان ہندوستانیوں کا ایک سفارتی زمرہ بنایا جائے، اور انھیں باہر کے ملکوں میں سفارتی عہدوں پر کام کرنے کی تربیت دی جائے۔ ہر ملک کا تجربہ بتاتا ہے کہ سیاست دانوں کو خواہ وہ پبلک زندگی میں کتنے ہی قابل اور ممتاز کیوں نہ ہوں، باہر کے ملکوں میں نمائندہ بنا کر بھیجنا خطرناک ہوتا ہے تا وقتیکہ ان کے عملے میں ایسے آدمی نہ ہوں جو سفارتی پالیسی اور طریقہ کار کے گروں سے واقف اور تربیت یافتہ ہوں۔

پچھلے دس سال کی مدت میں آہستہ آہستہ ہندوستان کی سمندر پار کی تجارت براہ راست اس کی اپنی نگرانی میں آتی جارہی ہے۔ اب ہندوستانی ایجنٹ اور تجارتی کمشنر، امریکہ، کناڈا، جنوبی امریکہ، مصر، ایران، افغانستان، جنوبی افریقہ، مشرقی افریقہ اور آسٹریلیا میں موجود ہیں۔ لڑائی سے پہلے ٹوکیو، برلن اور میلان

میں بھی ہندوستان کے تجارتی نمائندے رہا کرتے تھے۔ چونکہ سردست بیرونی ملکوں کے ان تجارتی کمشنروں کو کوئی سفارتی مرتبہ حاصل نہیں ہے اس لئے خالص تجارتی معاملات کے علاوہ اور باتوں میں کارروائی کرنے سے وہ معذور رہیں اور تاوقتیکہ انھیں سفارتی مرتبہ نہ دیا جائے وہ کسی قسم کا قنصلی کام نہیں کر سکتے۔ تجارت اور معاشیات دونوں سفارتی تعلقات کا اہم جزو بن چکے ہیں۔ ضرورت اس کی ہے کہ محکمہ تجارت (کامرس ڈیپارٹمنٹ) اور محکمہ امور خارجہ میں باہمی مفاہمت پیدا کی جائے تاکہ ہمارے تجارتی نمائندے ان دونوں محکموں کے اطمینان کے مطابق اپنے دہرے فرائض پورے کر سکیں اس کی سب سے بہتر صورت یہی ہو سکتی ہے کہ نوجوان ہندوستانی سفارتی عہدہ داروں کو محکمہ تجارت کی نگرانی میں کام سکھایا جائے اور ساتھ ہی محکمہ تجارت کے عہدہ دار محکمہ اُمور خارجہ کے کاموں کی واقفیت حاصل کریں محکمہ اُمور خارجہ کے وہ کون سے خاص کام ہیں جو فی الوقت دلچسپی کا موضوع بنے ہوئے ہیں۔ ان بڑے بین الاقوامی معاملات کی بحث جو ہمیشہ درپیش رہتے ہیں، اور جو ہندوستان اور ساری دنیا میں مشترک ہیں، ہم مناسب مقام پر کریں گے، لیکن ان کے علاوہ کچھ ایسے روایتی اور مہارت طلب معاملات بھی ہیں جن کا تعلق ہندوستان کی قریبی سرحدوں سے ہے اور جو اس محکمہ کے دائرہ عمل میں داخل ہیں۔ ان سے ایک علیحدہ باب میں بحث کرنے کی ضرورت ہے۔

تیسرا باب

قبائلی علاقے اور سرحدی ریاستیں

ہندوستان کی شمال مغربی اور شمال مشرقی دونوں سرحدوں پر ایسے منطقے موجود ہیں جنھیں قبائلی علاقے کہا جاتا ہے اور جو برطانوی ہندوستان کی انتظامی حدوں اور ہندوستان کی بیرونی سرحدوں کے درمیان حد فاصل ہیں۔ دو جگہوں کے سوائے، جن میں سے ایک بلوچستان میں ہے اور دوسرا ٹیری گڑھوال، اور کسی جگہ ہندوستان کی انتظامی حد اور بیرونی سرحد ایک دوسرے سے نہیں ملتی ان قبائلی علاقوں کی رعایا نیم خود مختار قسم کی ہے اور حکومت ہند کے ساتھ اس کے تعلقات گورنر جنرل کے ان ایجنٹوں کے توسط سے قایم ہیں جن کے علاقہ میں وہ آباد ہے۔ سرکار ہند کی پالیسی برابر یہ رہی ہے کہ ان علاقوں میں تدریجی طور پر بود و باش کے باقاعدہ حالات پیدا کیے جائیں، چنانچہ اس غرض سے اس نے مقامی اور قبائلی زندگی کے ڈھرے کو دھکا پہنچائے بغیر سڑکیں، ہسپتال اور مدرسے بنائے ہیں اور معاشی حیثیت سے ان علاقوں کو ترقی دی ہے۔ ان علاقوں کے مقامی پولیٹیکل افسروں کے سامنے سب سے بڑا سوال پہرہ چوکی کا ہے۔ چونکہ قبائلی باشندے نیم وحشی زندگی بسر کرتے ہیں اور ان کے علاقے

معاشی حیثیت سے پست ہیں، اِس لیئے وہ آس پاس کے برطانوی اضلاع پر کبھی کبھی دھاوے بول دیتے ہیں سرحد پر امن داماں کے انتظام کے سلسلہ میں ایک اعلیٰ درجہ کی شہری فوج وجود میں آگئی ہے، جس نے سرحد پر پہرہ چوکی کی اعلیٰ اور بہادرانہ روایات قایم کردی ہیں۔ اس فوج کی تنظیم نیم فوجی اصولوں پر کی گئی ہے۔ لیکن اس کا اعتماد زیادہ تر اپنی نقل وحرکت کی قابلیت اور جسمانی صلاحیت پر ہے، اور وہ جھڑپ بازی میں جو قبائلی باشندوں کا خاص مشغلہ ہے خود ان سے بھی سبقت لیجاتی ہے ٹوچی اور جنوبی وزیرستان کے اسکاوٹوں، کرم کی ملیشیا جمعیت، چترال اور گلگت کے اسکاوٹوں اور آسام رائفلز کے نام خاصے معروف اور مشہور ہیں اور ان کے تفصیلی بیان کی ضرورت نہیں ہے۔ ان جمعیتوں میں زیادہ تر ایسے نوجوان فوجی افسر جاتے ہیں جنھیں مہم جوئی کا شوق ہو۔ ان علاقوں کے اندرونی انتظام کی ذمہ داری پولیٹکل افسروں پر ہوتی ہے جو قبائلی چودھریوں کے توسط سے، اور قبائلی دستور کے مطابق ان کے مقامی جھگڑے چکاتے ہیں۔ قبائلی باشندوں میں سے بعض نہایت اعلیٰ درجہ کی سپاہیانہ صلاحیت رکھتے ہیں۔ ہندوستان کے بچاؤ اور ہندوستان کی سرحدوں کی سلامتی میں ان کی خیرخواہی اور دوستانہ تعلقات سے قابل قدر مدد ملتی ہے۔ موجودہ لڑائی میں ناگا پہاڑی کے قبیلے والوں نے جو مدد کی ہے وہ بھولی نہیں جا سکتی، اور نہ اسے بھلانا چاہیئے پس ان علاقوں میں امن و امان اور انتظامی نگرانی قائم رکھنا ہندوستان کی سلامتی اور امن و امان کا ایک لازمی جزو ہے

سرحدی ریاستیں۔

ان میں سب سے زیادہ اہم بلوچستان کی ریاستیں، قلات، لاس بیلہ اور خاران شمال مغربی سرحدی صوبہ کی ریاستیں دیر، سوات اور چترال، گلگت ایجنسی کی

ریاستیں۔ ہنزا، ناگر، نیپال اور کوہ عزر اور ہمالیہ کے دامن میں سکم اور بھوٹان ہیں۔ ان ریاستوں کو نمائندہ تاج کے ماتحت دیسی ریاستوں کا درجہ حاصل ہے لیکن ان کے خاص حالات کی وجہ سے ان کے معاملات کا تعلق محکمہ امور خارجہ سے ہے۔ ہندوستان کی سرحدوں پر ان ریاستوں کے محل وقوع کی وجہ سے ان کے مسائل "خارجہ" نوعیت کے بن گئے ہیں۔ دراصل ان علاقوں کے اندرونی انتظام میں دخل دینے کی ضرورت بہت کم پڑتی ہے۔ خوش قسمتی سے ان میں بسنے والے قبیلوں میں ایسے لیڈر پیدا ہو گئے ہیں جو ان پر حکومت کرنے کی قدرتی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ہندوستان کے لیئے اِن ریاستوں کی خاص اہمیت یہ ہے کہ وہ اس سرحد پر جو ان کے علاقوں کے اندر واقع ہے امن وامان قائم رکھ سکیں۔ ان کی وجہ سے ہندوستانی خزانہ پر اِن چھوٹی مہموں کا بار نہیں پڑنے پاتا جو کبھی کبھی، اور خاص طور پر ایسے علاقوں میں ضروری ہوتی ہیں جہاں کے قبیلے بے سردار کے ہوں اور جہاں پہرہ چوکی کی ذمہ داری سرکار ہند کے سر ہے۔ اِن سرحدی حکمرانوں میں سے بعض روشن خیال ہیں اور غیر معمولی انتظامی صلاحیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنے علاقوں میں نظم اور انتظام کے اعلیٰ طریقے رائج کیئے ہیں۔ ایسے حکمرانوں کی ایک ممتاز مثال والی سوات ہیں جنھوں نے قبائلی لوگوں سے ہتھیار رکھوا کر نہ صرف اپنے علاقہ میں پہرہ چوکی کے مسئلہ کو حل کر دیا ہے بلکہ امن پسندانہ مشاغل، مثلاً کھیتی باڑی اور گھریلو صنعتیں پیدا کر کے اور سڑکیں بنوا کر اور ٹیلیفون کا ایک اچھا سلسلہ قائم کر کے سرحدی علاقہ میں امن وامان قائم رکھنے کی ایک قابل تقلید مثال پیش کر دکھائی ہے۔ بدقسمتی سے اِن قبائلی علاقوں میں جہاں کوئی سردار نہیں ہے لوگ اتنے انفرادیت پسند ہوتے ہیں کہ اِن میں ایسے سردار پیدا نہیں ہوتے جن کا حکم سب مانیں۔ ایسے قبیلوں کے ساتھ سرکار ہند کو لازمی طور پر براہ راست سروکار رکھنا پڑتا ہے۔

حجابی ریاستیں[1]

افغانستان :- انیسویں صدی کے آخر میں جب ہندوستان کے طول وعرض میں انگریزی راج قائم ہوگیا تو سوائے روس کے ایشیا میں کوئی اور طاقت ایسی نہیں تھی جس سے ہندوستان کو خطرہ ہو۔ چنانچہ صحیح یا غلط طور پر انگریز روس ہی کو اپنے ایشیائی مقبوضات کے لئے سب سے بڑا خطرہ سمجھنے لگے۔ افغانستان کے ساتھ لڑائیاں اور ایران کے معاملات میں انگریزوں کی جارنا چار دلچسپی۔ یہ اسی خوف کا قدرتی نتیجہ تھے
افغانستان کے ساتھ ہندوستان کے تعلقات کئی دوروں سے گزر چکے ہیں ایک خاص عہدنامہ کی رو سے افغانستان کی ان حدود کا جو روس اور ہندوستان سے ملحق ہیں تعین کیا گیا اور روس اور انگلستان دونوں نے افغانستان کی سرحد کے احترام کی ضمانت کی۔ ۱۹۱۹ء کی تیسری جنگ افغان کے بعد انگریزوں نے افغانستان کی خود مختاری کو تسلیم کرلیا، اور ہندوستان اور افغانستان کے درمیان ایک عہدنامہ کی رو سے افغانی درآمد اور برآمد کے لئے ہندوستان میں ایک آزاد راستہ قائم کر دیا گیا۔ افغانستان ایک پہاڑی ملک ہے جس کے مشرقی اور جنوبی حصوں میں پٹھان یا افغان قبائل آباد ہیں جو ہندوستان کی سرحد کے اندر رہنے والے اپنے ہم قبیلہ لوگوں کے ساتھ گہرا ربط اور سماجی اور معاشی تعلقات رکھتے ہیں۔ ان کے پاس نئی قسم کی رائفلیں ہیں، اور ان کی شورہ پشتی ضرب المثل ہے۔ چنانچہ جب کبھی افغانستان کے اندرونی امن وامان میں خلل پڑتا ہے تو اس کا اثر ہندوستان کی شمالی مغربی سرحد پر ضرور پڑتا ہے۔ شمالی افغانستان کی آبادی تاجیک اور ازبکوں پر مشتمل ہے جو تمر کی نسل کے لوگ ہیں۔ اور جن کے کچھ گروہ سوویٹ روس

[1] ایسی ریاست جو دو کشوروں کے درمیان بطور حجاب واقع ہو (بفر اسٹیٹ)۔

میں بھی آباد ہیں۔ مغربی اور جنوب مغربی علاقوں کے باشندے ایرانیوں سے ملتے جلتے ہیں۔ احمد شاہ درانی کے حملہ ہندوستان کے بعد سے افغانستان کے حکمران خاندان کا سلسلہ کسی نہ کسی درانی قبیلہ ہی سے رہا ہے۔ موجودہ حکمران خاندان بارک زئی قبیلہ کی محمد زئی شاخ سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ شاخ قندھار میں آباد ہے۔ تقریباً سارے افغانی سنّی اور حنفی المذہب ہیں۔ حال میں حکمران طبقہ کی طرف سے ملک میں تعلیم اور جدید خیالات کو رواج دینے کی زبردست کوشش کی گئی ہے۔

ہندوستان اور افغانستان آپس میں بڑے پیمانہ پر تجارت کرتے ہیں۔ افغانستان کی خاص برآمدات ہمور، قالین اور تازہ اور خشک میوے ہیں۔ ہندوستان افغانستان کو پٹرول، شکر، چاء، گیہوں، طرح طرح کی استعمالی چیزیں اور مشینری بھیجتا ہے۔ افغانستان کے پاس اپنی کوئی بندرگاہ نہیں ہے اور وہ اپنی سمندر پار کی تجارت کے لیئے ہندوستانی بندرگاہوں کا دست نگر ہے۔ اِس طرح اِن دونوں ملکوں کے درمیان ایک قریبی معاشی رشتہ قائم ہے۔

افغانستان کی خود مختاری اور ہندوستان کے ساتھ اس کے دوستانہ تعلقات یہ دونوں چیزیں ہندوستان کے بچاؤ کے لیئے ناگزیر ہیں۔ فوجی، سیاسی، معاشی، تجارتی اور ثقافتی لحاظ سے، غرض کہ ہر حیثیت سے ہندوستان کے لیئے ضروری ہے کہ وہ جس طرح بھی ہوسکے افغانستان کے ساتھ اپنی ہمسائگی کے تعلقات کو اور زیادہ مضبوط بنائے۔

نیپال شمال اور شمال مشرق میں ہندوستان کی سرحد کے ڈانڈے چین سے ملتے ہیں۔ نیپال اور تبت کے علاقے جو ہمالیہ سے لگے ہوئے ہیں ہندوستان اور چین کے درمیان حد فاصل ہیں۔ نیپال کے ساتھ ہندوستان کا لگاؤ ان دو

لڑائیوں کی وجہ سے ہوا جو ہندوستان کو اپنی حفاظت کے لیے لڑنی پڑی ہیں۔ عہدنامہ سگولی کی رو سے کچھ علاقہ ہندوستان کو مل گیا۔ اور نیپال کے ساتھ اس کے تعلقات مضبوط ہندوستانہ بنیادوں پر قائم ہو گئے۔ گورکھے جو کسی زمانہ میں ہندوستانی اور انگریزی فوجوں کے خلاف بہادری سے لڑتے تھے بعد کو ہندوستان کی لڑیت فوجوں کا خاص حصہ بن گئے۔ لاکھوں نیپالی آج ہندوستان میں سول مشاغل میں کھپے ہوئے ہیں۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد نیپال کی خودمختاری تسلیم کر لی گئی اور بعد کو ایک تجارتی اور معاشی عہدنامہ کی رو سے نیپال کو بھی ہندوستان کے ساتھ درآمد برآمد کی وہی آسانیاں دی گئیں جو افغانستان کو حاصل ہیں۔ نیپال ایک ہندو ریاست ہے، اور اگرچہ اس کے پہاڑی علاقہ کے باشندے بدھ مت کے پیرو ہیں اور نسل کے اعتبار سے منگول ہیں، پھر بھی یہ ملک بجائے تبت اور چین کے ہندوستان ہی کو اپنی قدرتی گزرگاہ سمجھتا ہے۔ نیپال ایک پست حال ملک ہے اور ضرورت ہے کہ اسے صنعتی بنایا جائے۔ ہندوستان کی طرف سے اس ملک میں نئی باتیں رائج کرنے کی جو کوشش بھی کی جائے گی وہ ایک طرح سے خود اس ملک (ہندوستان) کے لیے فائدہ مند ہو گی کیونکہ اس طرح ہندوستان کی تجارت کی مقدار بڑھے گی اور یہاں کے ہنرمند مزدوروں کو کام ملے گا۔ اس لیے نیپال کی خیرخواہی حاصل کرنا ہندوستان کے لیے بہت زیادہ قدروقیمت رکھتا ہے سیاسی حیثیت سے نیپال ہندوستان اور شمال کے درمیان ایک طرح کی حجابی ریاست ہے تہذیبی حیثیت سے ہندو ہندوستان کے ساتھ اسے گہرا لگاؤ ہے۔ یہی وہ دیس ہے جہاں شروع شروع میں مہاتما بدھ نے سفر کئے۔ گورکھے ہمیشہ ہندوستانی فوجوں کا ایک قابل قدر جزو بنے رہیں گے۔ بڑے افسوس کی بات ہو گی۔ اگر ہندوستانی قوم پرست نیپال اور افغانستان کے ساتھ ہندوستان کے تعلقات کے بارے میں

وسعت نظر سے کام نہ لیں گے، اور انتہائی بدبختی ہوگی اگر مسلم ہندوستان کو ان میں سے ایک اور ہندو ہندوستان کو دوسرے ملک کی طرف سے پھیرنے کی کوشش کی گئی اور اس طرح ان دونوں ملکوں کے ساتھ پورے ہندوستان کی دوستی کو غارت کر دیا گیا خوش قسمتی سے نیپال اور افغانستان دونوں ملکوں کے حکمران طبقے اس بارے میں ان عناصر سے زیادہ دور اندیش ہیں جو ہندوستان کی سیاسی زندگی میں انتشار پھیلانا چاہتے ہیں۔ افغانستان اور نیپال کی حکومتیں ہندوستان کو ایک ملک اور اس کے باشندوں کو ایک قوم مانتے ہیں۔ ادھر اکثر سمجھدار اور بصیرت رکھنے والے ہندوستانی بھی یہ کوشش کر رہے ہیں کہ کسی طرح بین قومی سیاسیات میں فرقہ واریت پیدا کرنے کے اس رجحان کی جو ان کے کسی قدر کوتاہ اندیش ہموطنوں میں پیدا ہو گیا ہے روک تھام کریں۔

۳۔ تبت ہم اوپر کہہ آئے ہیں کہ نیپال اور تبت دونوں خودمختار ملک ہیں تبت کی حیثیت کسی قدر تشریح چاہتی ہے۔ چین تبت کو اپنا ہی ایک حصہ سمجھتا ہے لیکن ۱۹۱۲ء میں تبت والوں نے چینی فوجوں کو اپنے ملک سے نکال باہر کیا تھا، اس کے بعد ۱۹۱۳ء سے ۱۹۱۴ء میں شملہ میں ایک تین فریقی کانفرنس اس غرض سے کی گئی کہ چین کے مقابلہ میں تبت کے مرتبہ اور اس کی سرحدوں کو معین کر دیا جائے، لیکن چین کی نئی جمہوری حکومت نے اس کانفرنس کے فیصلوں کو رد کر دیا۔ برطانوی حکومت کی پالیسی اس بارے میں یہ ہے کہ وہ تبت پر چین کے حق اقتدار کو ماننے پر تیار رہے بشرطیکہ چین بھی تبت کی خودمختاری کو ایک امر واقعہ کی حیثیت سے مان لے اور اسکا احترام کرے۔ اس کے بعد سے تبت نے چین کے بجائے سرکار ہند کو اپنے خارجہ تعلقات کا واسطہ بنا لیا ہے چونکہ اب ہندوستان اور چین دونوں تبت کی مقامی خودمختاری میں دلچسپی رکھتے ہیں اور دونوں ملک یہی چاہتے ہیں کہ تبت اپنی روایات کے بموجب ترقی کرے اس لئے تبت کے

مسئلہ پراب اِن دونوں ملکوں کے درمیان کسی غلط فہمی کا امکان نہیں ہے۔ تبت ایک زمین بستہ ملک ہے اور سمندر تک اس کے پہنچنے کا فاصلہ چین کی بہ نسبت ہندوستان ہو کر کم ہے۔ اِس لئے ہندوستان کے ساتھ تجارت کرنا تبت کے لئے زیادہ آسان ہے۔ ہندوستانی تاجر نمک، مسالے اور استعمالی چیزیں وہاں بھیجتے ہیں اور تبت ہندوستان کو ریشم اور اون بھیجتا ہے ہندوستان و تبت کی درمیانی سرحد کے کچھ علاقے ابھی تک پوری طرح معین نہیں ہیں لیکن اس کی وجہ سے اِن دونوں ملکوں کے درمیان کبھی کوئی غلط فہمی پیدا ہونے نہیں پائی۔ یہ مسئلہ دوستانہ بات چیت سے طے ہو جائے گا اگر میں سرکار ہند کے نمائندے کی موجودگی سے دونوں ملکوں کو اپنے آپس کے سیاسی معاشی اور تہذیبی تعلقات کو مضبوط بنانے کا موقع ملتا ہے۔ تبت کے باشندے بعض باتوں میں ایشیا کے سب سے اچھے لوگ کہے جاتے ہیں۔ اِن کے سیاسی اور حکومتی معاملات بدھ مت کے نصب العین کے مطابق ہیں چنانچہ دلائی لاما اور اس کے ماتحت لاماؤں کی حکومت جو حکومت الہٰیہ کے اصولوں پر چلائی جاتی ہے اس کا ثبوت ہے۔ ہندوستان اور تبت کے باشندے آپس میں گہرا تصوراتی تعلق رکھتے ہیں چنانچہ تبت والے سنسکرت حروف تہجی استعمال کرتے ہیں اور دوسری طرف بدھ مت نے ہندوستان ہی میں جنم لیا تھا نقل وحمل کے نئے نئے طریقوں کی وجہ سے اب ہمالیہ پہاڑ ویسی رکاوٹ نہیں رہا جیسا کہ پہلے تھا ابھی سال دو سال کی بات ہے کہ قازقوں کے جتھے کے جتھے تبت سے گھومتے ہوئے شمالی راستوں سے کشمیر آ پہنچے تھے۔ تبت میں تجارت کی ترقی کے بڑے امکانات ہیں اور ہندوستان بھی، بشرطیکہ وہ اس ملک کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم رکھے اِن سے پورا پورا فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔ آج کل بھی ہندوستان سے جو رسد چین جاتی ہے وہ تبت کے راستوں ہی سے جاتی ہے۔

لہ جس کے لئے کوئی دریائی یا سمندری گزرگاہ نہ ہو ۱۲

چوتھا باب

ہندوستان کے ہمسائے

(الف) خلیج فارس

ایران اور عرب کے وہ حصے جو خلیج فارس کے ارد گرد واقع ہیں اور جزیرہ بحرین۔ ان سب کو ملا کر خلیج فارس کا علاقہ کہا جاتا ہے۔ اس علاقہ میں زیادہ تر عرب ریاستیں ہیں۔ وسطی عرب کے بدوؤں یا ان قبیلوں کے مقابلہ میں جو عرب کے جنوبی ساحل کے آس پاس واقع ہیں، خلیج فارس کے علاقہ کی آبادی ملی جلی سمندری سفر کی عادی اور تجارت اور کاروبار کی شائق ہے۔ یہاں کے بازاروں میں آپ کو بڑے ہوشیار کاروباری لوگ نظر آئیں گے۔ بحرین ہی وہ مرکزی مقام ہے جہاں پچھلے سو برس میں برطانیہ کے سرکاری اغراض کے اثر سے جدت پسندی کا دور شروع ہوا اور اب امریکہ کے تجارتی اغراض کی وجہ سے اس میں مزید اضافہ ہوا ہے۔

ہندوستان اور خلیج فارس کے علاقوں کے درمیان صدیوں سے تجارت اور باہمی ربط چلا آرہا ہے۔ سمندری ڈاکوؤں کی روک تھام اور سمندری راستوں کی حفاظت کے سلسلے میں ہندوستان نے اس علاقہ میں بہت کچھ

روپیہ اور خون بہایا ہے اور اسی کے نتیجہ کے طور پر آج ہندوستان کی سیاسی رزیڈنسی بحرین میں قائم ہے اور خلیج فارس کا علاقہ رفتہ رفتہ ہندوستان کے سیاسی اثر کے تحت آگیا ہے۔ ہندوستان سے مسلے، چاول، گیہوں، کپڑا، استعمالی چیزیں اور مشینری خلیج کے علاقہ میں برآمد ہوتی ہیں، اور وہاں سے تیل اور کھجور وغیرہ کی درآمد ہوتی ہے۔ بحرین کے موتی ساری دُنیا میں مشہور ہیں۔ حال کے ایک اندازے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان اور خلیج کے علاقہ کے درمیان تجارت کی مالیت دو کروڑ روپیہ سالانہ ہے۔ ہندوستانی فرموں نے جو ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی ہیں خاصہ نام پیدا کرلیا ہے، اور وہاں ان کی بڑی عزت ہے۔ ہندوستان سے جو زائر عراق جاتے ہیں وہ خلیج کے راستہ ہی سے جاتے ہیں۔ ان دونوں ملکوں کے تعلقات نرے تاریخی اور زمانہ قدیم کے نہیں ہیں بلکہ نقل و حمل کے وسیلوں کی تبدیلی سے آئندہ اور گہرے ہوجائیں گے۔ خلیج فارس ہندوستان اور یورپ کے درمیان ہوائی راستہ پر واقع ہے۔

اس علاقہ کے ساتھ ہندوستان کی دلچسپی صرف معاشی معاملات ہی کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ خلیج کے علاقہ کی سلامتی اور خودمختاری میں گہری دلچسپی خود اس کے اپنے بچاؤ کے لئے بھی ضروری ہے۔ پچھلی اور موجودہ دونوں جنگوں میں ہندوستان کے بچاؤ کی لڑائیاں وسطی مشرق میں لڑی گئی تھیں اور ہندوستان کی سلامتی کو دشمن کی طرف سے جو خطرہ تھا اس کی روک تھام کے لئے ہندوستان کی حمایتی فوجیں خلیج ہی کے راستہ سے گئی تھیں۔ جاپانیوں کا منصوبہ یہ تھا کہ اگر

جرمن قفقاز پار کرلیں تو وہ اسی علاقہ میں ان کے ساتھ مل جائیں گے۔
اس سے ظاہر ہے کہ اس علاقہ نیز عدن پر جس ملک کا بھی تصرف ہوگا وہ ہندوستان اور پوربی افریقہ اور انگلستان اور اسٹریلیا کے درمیان سمندری راستوں کے لئے خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔ انہی مفادات کی حفاظت کے لئے ہندوستان نے ایک خاص پالیسی بنالی ہے اور اس کی تکمیل کے ضروری انتظامات بھی کرلئے ہیں۔ مقامی شیوخ اور حکمرانوں کے ساتھ ہندوستان کے تعلقات خلیج فارس کے رزیڈنٹ کے توسط سے قائم ہیں جس کے ماتحت کئی پولیٹکل افسر ہیں۔ ہندوستان اور برطانیہ کے آئندہ تعلقات پر غور کرتے وقت ان حقوق کا بھی لحاظ رکھنا پڑے گا جو ان حکمرانوں کو عہدناموں کی رو سے حاصل ہیں۔ ہندوستان میں اس علاقے کے باشندوں کے لئے جدید سائنٹفک طریقے سیکھنے اور ایسی عام تعلیم حاصل کرنے کے بےشمار موقعے ہیں جن کی بدولت وہ خود اپنے ملکوں کو ترقی کی راہ پر لگا سکیں۔

(ب) فارس یا ایران

اپنی جغرافیائی حیثیت کی وجہ سے ایران بھی ہندوستان کا اہم ہمسایہ ہے۔ ٹرانس پرشین (ماورائے ایران) ریلوے نے روس اور خلیج فارس کے درمیان ایک نیا راستہ کھولدیا ہے اور جنگی رسد پہنچانے کے سلسلہ میں جو اور راستے بنے ہیں وہ خلیج فارس تک اور نشکی، زاہدان اور مشہد سے ہوکر آتے ہیں۔ ایران کے تیل کے چشمے ایشیا میں سب سے زیادہ میسر حاصل ہیں اور ان میں متعدد ہندوستانی کام کرتے ہیں۔ ہندوستان کو جن ذریعوں سے پٹرول ملتا

ہے ان میں ان چشموں کا بھی خاص حصّہ ہے اور جوں جوں ہندوستان کی صنعت ترقی کرے گی کارخانے چلانے کے لئے ایران کے تیل کا استعمال اور بڑھ جائے گا۔ ہندوستان ایران کو چائے، کافی کھانے پینے کی چیزیں اور استعمالی چیزیں برآمد کرتا ہے۔ ہندوستان سے جو زائر عراق جاتے ہیں اور راستہ میں مشہد اور قُم کی زیارت گاہوں پر بھی حاضری دینا چاہتے ہیں وہ زاہدان۔مشہد کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ ایرانی کلچر (ثقافت) نے ہندوستان پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے۔اس نے ہماری شاعری اور فنِ تعمیر کو مالا مال کیا ہے۔ اکثر سماجی (سوشل) رسوم آج بھی ہندوستانیوں اور ایرانیوں میں مشترکہ طور پر پائی جاتی ہیں۔

دو عالمگیر جنگوں کے درمیان جو زمانہ گذرا اس میں ایران نے ریاستی اجارہ داری کی پالیسی شروع کر دی تھی جس کی وجہ سے اس کے ساتھ ہندوستان کی تجارت قریب قریب ختم ہوگئی۔ مغربیت پسندی کی جو پالیسی رضا شاہ نے جبراً چلائی تھی اگرچہ اس کا اثر محض نمائشی اور سطحی ہوا، پھر بھی اس کی بدولت ایرانیوں میں اپنی برتری کے متعلق کچھ غلط فہمی ہوگئی اور ہندوستانیوں کے ساتھ ان کے تعلقات میں کھچاؤ اور دوری پیدا ہوگئی۔ امید ہے کہ اب ایرانیوں کو کچھ سمجھ آجائے گی اور تعلقات کا ایک نیا باب شروع ہوگا جس سے ایرانیوں میں ہندوستان کے بارے میں پہلے سے زیادہ مفاہمت پیدا ہوجائے گی۔

ایرانی بڑے پرلطف اور خوش اخلاق ہوتے ہیں۔ اس عربی اثر کے باوجود جو ایران میں اسلام کے شروع ہونے کے بعد پھیلا، انھوں نے اپنا الگ طرزِ زندگی قائم رکھا ہے۔ ان کی شاعری اور

ادبیات، فنون اور کلچر سے ساری دنیا نے فیض پایا ہے۔ نہایت افسوس کی بات ہوگی اگر ایشیا کا یہ مایہ ناز ورثہ محض مغرب کی سطحی نقالی کی وجہ سے خراب ہو جائے۔ ایران اور ہندوستان دونوں ایک دوسرے کو بہت کچھ دے سکتے ہیں۔ قدرت کا منشا یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں ملک اچھے ہمسایوں کی طرح رہیں، اور آگے چل کر ایشیا کی نجات بھی ان کے آپس کے گہرے تعاون پر منحصر ہے۔ حال میں ایرانی کلچرل مشن (ہیئت فرہنگی ایران) کے ہندوستان کے دورہ سے آپس کی مفاہمت بڑھ گئی ہے اور امید کی جاتی ہے کہ جب ہندوستان سے ایک مشن دورہ باز دید پر ایران جائے گا تو دونوں ملکوں کے درمیان پائیدار دوستی کا راستہ کھل جائے گا۔

پچھلے زمانہ میں ایران کے ساتھ ہندوستان کو جو کچھ دلچسپی رہی ہے وہ محض اس حیثیت کی وجہ سے تھی جو روس اور برطانیہ کے درمیان اس ملک کو حاصل تھی۔ خوش قسمتی سے ان دونوں ملکوں کی آپس کی رقابتیں اب ختم ہو رہی ہیں، اور اب روس، ایران اور برطانیہ کے درمیان ایک سہ فریقی عہد نامے کی رو سے، بیس سالہ دوستی کا معاہدہ ہو چکا ہے جس میں ایران کی آزادی کی بھی ضمانت کی گئی ہے۔ امریکہ نے بھی ان معاہدوں کی توثیق کر دی ہے جس سے امید بندھتی ہے کہ شاید تعلقات کی یہ نئی تبدیلی پائیدار ثابت ہو۔ غرضکہ اب ایران کو اپنی آزادی اور اپنی انفرادیت سے ہاتھ دھونے کا کوئی اندیشہ نہیں رہا۔ اس علاقہ کی سفارتی (ڈپلومیٹک) بازیاں آیندہ دو فریقی نہیں بلکہ سہ فریقی ہونگی۔ تعمیر بعد جنگ میں ہندوستان ایران کے بہت کچھ کام آسکتا ہے ادھر

سے ایران ہندوستان کو پہلے کی طرح ثقافتی (کلچرل) امداد پہنچا سکتا ہے سیاسی ور معاشی حیثیت سے بھی دونوں ملک ایک دوسرے کے زیادہ قریب آسکتے ہیں اور اگر ایسا ہوا تو یہ دونوں آئندہ چل کر جنوبی نصف ایشیاء کی سلامتی کے سلسلے کی اہم کڑیاں بن جائیں گے۔

(ج) سنک یانگ

سنک یانگ چونکہ چین کا ایک صوبہ ہے اس لئے وسط ایشیا کے اس حصہ کے ساتھ ہندوستان کے تعلقات کو ہندی چینی تعلقات کا ایک جز سمجھنا چاہیئے۔ موجودہ لڑائی کے شروع ہونے تک ہندوستان کے تعلقات اگر چین کے کسی حصہ کے ساتھ قریبی اور گہرے رہے ہیں تو وہ سنک یانگ ہی تھا۔ اس علاقہ کی خوش حالی میں ہندوستانی تاجروں نے بہت کچھ حصہ لیا ہے اور جان اور مال کا بے انتہا نقصان اٹھایا ہے، خصوصاً لڑائی سے فوراً پہلے جو زمانہ گذرا اس میں ہندوستانی تاجروں کی حالت یہاں نا قابل بیان تھی۔ مقامی نظم و نسق نے اپنی ایک علیحدہ حیثیت اختیار کرلی تھی اور محض برائے نام چین کی مرکزی حکومت کی پابندی کرتی تھی امن پسند ہندوستانی تاجروں کے ساتھ اس کی پالیسی ایذارسانی اور بدسلوکی کی ہوگئی تھی۔ ان مشکلوں کے باوجود محض ہندوستانیوں کی حوصلہ مندی کی وجہ سے ہمارے ملک نے وسط ایشیاء میں اپنا ایک خاص مقام پیدا کرلیا اور کاشغر میں ہندوستانی قنصل جنرل کا دفتر کھل گیا۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ سنک یانگ میں ہندوستانی

تجارت اب ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئی ہے اور اس کی جگہ روسی تجارت لے لیگی۔ یہ یاس انگیزی حق بجانب نہیں ہے۔ اگر مناسب کارروائیاں کی جائیں تو اب بھی ہندوستان کو اپنی مشنیری اور اپنے سامان کے لئے چینی ترکستان میں بازار ہاتھ آسکتے ہیں۔ منافع بازیوں کا وحشیانہ دَور اب ختم ہوگیا ہے اور ہندوستانی تاجروں کو چاہئے کہ کارکردگی اور مقابلہ کے موجودہ حالات کا ساتھ دیں۔ کاشغر کے ریشم، اون اور نمدوں کی کھپت ہندوستانی بازاروں میں ہمیشہ رہے گی، دوسری طرف کاشغر کو ہندوستان کی مشنیری اور استعمالی چیزوں کی ضرورت ہوگی گلگت کے علاقہ اور سنک یانگ میں ہوائی جہازوں کے اترنے کے لئے اچھے میدان موجود ہیں۔ لِہ (LEH) کا راستہ اب بھی ہندوستان اور وسط ایشیا کے درمیان نقل وحمل کی ایک اہم کڑی ہے۔ کاشغر میں ہندوستانی قنصل جنرل کا دفتر ہندوستان کو ایشیا کے اُن دور دراز حصوں کے حالات سے باخبر رکھتا ہے اگر وسط ایشیا کی یہ قدم گاہ ہندوستان کے ہاتھ سے نکل گئی تو بڑے افسوس کی بات ہوگی۔ جاپانیوں نے منچوریا میں جو دخل پالیا ہے، اور بیرونی منگولیا اور سنک یانگ میں جو ساز باز کر رہے ہیں اس سے ہندوستان کو پہلے ہی سے خطرہ ہے۔ اگر آگے چل کر روس، چین اور ہندوستان کو اچھے ہمسایگی کے تعلقات رکھنا ہیں تو ایشیا کی ان تین بڑی طاقتوں کے لئے سنک یانگ سے بہتر اور کوئی نقطہ اتصال نہیں ہے۔

پانچواں باب

جنوب مشرقی ایشیا

پورب میں ہندوستان کے پڑوسی، جو چھوٹی چھوٹی ریاستوں کا مجموعہ ہیں اور جنہیں ایک طرح سے ایشیا کا بلقان کہنا چاہیئے، ایک الگ ہی علاقہ ہیں، اس لئے ان سے علیحدہ بحث کرنا ضروری ہے۔ ان ملکوں کو جن میں برما، سیام، ہند چینی، ملایا اور ڈچ ایسٹ انڈیز (مشرقی ہند کے جزیرے) شامل ہیں بعض اوقات "باہری ہندوستان" (FURTHER INDIA) کہا جاتا ہے۔ ہندوستان اور اس کے زمانۂ قدیم کے نوآبادیاتی علاقوں میں جو رشتہ باقی ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ڈچ لوگ مشرقی جزائر (ایسٹ انڈیز) میں اپنے مقبوضات کو "ہندوستان" اور اس کے مقابلہ میں خاص ہندوستان کو "برطانوی ہندوستان" کہتے ہیں۔ ہندوؤں میں پردیس کے سفر کی ممانعت اور "کالے پانی" سے ان کی بیزاری یہ نسبتاً حال کی خصوصیتیں ہیں، ورنہ دو ہزار برس پہلے ہندو ملاح دور دراز سمندروں کو چھانا کرتے تھے۔ اس میں ذرا شک نہیں کہ انہی ملاحوں کی وجہ سے ہندو آبادکار ہند چینی جزیرہ نما انڈونیشیا کے جزیروں اور فلپائن بلکہ شاید پیسفک

میں اس سے بھی آگے تک پہنچے اس علاقہ میں جو ریاستیں انہوں نے قائم کیں وہ ہندو نمونے کی تھیں۔ سنسکرت ناموں کی بھرمار تھی۔ عبادت کا طریقہ بھی ہندوانہ تھا۔ یہ سلسلہ ایک ہزار سال سے اوپر تک چلتا رہا۔ جاوا کی سری وجے سلطنت جس نے بورو بودر کا مشہور مندر بنایا اصل میں ایک ہندو سلطنت تھی، اسی طرح سے کمبوڈیا کی سلطنت بھی جو تاریخ کے وسطی دور میں قائم ہوئی اور جس نے انگ کور واٹ کے مندر بنائے۔ وہ بھی ہندو سلطنت تھی۔

گیارہویں صدی میں انڈونیشیا اور جنوبی ہندوستان کے بیڑوں میں جو لڑائی ہوئی اور اس کے بعد بارہویں صدی میں عرب سمندری قزاقوں کے ہاتھوں ان دونوں کی تباہی نے اس علاقہ میں ہندوستان کے اثر کو کمزور کر دیا۔ ہندوستان کے ساتھ رسل و رسائل کا سلسلہ کٹ جانے کی وجہ سے یہاں کے باشندے رفتہ رفتہ ہندو نہ رہے یا پھر انہوں نے اپنی ہندو تہذیب میں اسلامی، چینی، اور آخر میں چل کر مغربی خصوصیات داخل کر دیں۔ اس کے باوجود اس علاقہ میں اب بھی جس حد تک ہندو پن موجود ہے اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ سیام کے راج محل کی طرف سے بعض راج ریتوں کو پورا کرنے کے لئے آج بھی ایک برہمن طبقہ کی پرورش جاری ہے۔ سیامی حروف تہجی کی اصل ہندوستانی ہی ہے۔ لوگ اب بھی سنسکرت نام رکھتے ہیں اور ہندوستان کو اپنی تہذیب کا گہوارہ سمجھتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ کمبوڈیا کی پرانی سلطنت میں جو اب ہند چین کا حصہ ہے قدیم ہندو درباری رسموں کی فرسودہ شکل اب بھی باقی ہے۔ ہم ایک ایک ملک لیکر یہ دیکھیں گے

کہ آج بھی ہندوستان کو اس علاقہ کے ساتھ کیا تعلق ہے۔ جنگ سے پہلے ان علاقوں میں ہندوستانی آبادی کا اندازہ حسب ذیل تھا:۔

برما .... ——— ۱۰،۱۷،۸۲۵

ملایا .... ——— ۷،۵۰،۰۰۰

سیام .... ——— ۵۵،۰۰۰

ہندچین .... ——— ۵،۰۰۰ سے ۶،۰۰۰ تک

ڈچ ایسٹ انڈیز ...... ——— ۲۸،۰۰۰ سے ۳۰،۰۰۰ تک

تجارتی تعلقات کا خلاصہ حسب ذیل ہے:۔

ملک	برآمد		درآمد	
	چیزیں	مالیت	چیزیں	مالیت
برما	کوئلہ اور کوک، مچھلی، پھل، ترکاری، گیہوں کا آٹا، لوہا اور فولاد، مونگ پھلی کا تیل، کاغذ، مونگ پھلی، چھالیا، شکر، چائے، روئی، سوت، کٹ پیس، سن کی مصنوعات، تمباکو، سگرٹ ،	۸،۷۶،۹۰،۰۰۰	پھل اور ترکاری، دال، چاول (چھلکے دار) دیاسلائیاں، سیسہ، مٹی کا تیل، چکنانے والے تیل، پٹرول وغیرہ ساگوان ۔	۲۲،۱۴،۹۴،۰۰۰
ملایا	کوئلہ اور کوک، رسیاں، روئی کا سامان، چارہ، غلہ (چاول، چمڑا اور کھالیں، سن کا سامان، بیج ۔	۲،۰۳،۹۷،۰۰۰	بید، سوکھی مچھلی، ٹین، معدنی تیل، کھانے پینے کا سامان اور اسٹور، مسالے	۴۴،۱۳،۰۶،۰۰۰

ملک	برآمد		درآمد	
	چیزیں	مالیت	چیزیں	مالیت
سیام	روئی کا سامان، سن۔ بورے	۶۹,۶۴,۰۰۰	ساگوان	۹,۴۲,۰۰۰
ہند چین	سن کا سامان	۶۸,۲۴,۰۰۰	متفرق چیزیں	۱۳,۹۳,۰۰۰
ڈچ ایسٹ انڈیز	کوئلہ اور کوک، چاول، سن، بورے	۸۲,۷۳,۰۰۰	معدنی تیل، شراب، شکر،	۱,۷۴,۱۵,۰۰۰

برما

برما ۱۹۳۷ء میں ہندوستان سے علیحدہ ہوا۔ اس وقت سے اب تک ہندوستان اور برما کے سامنے کئی ایسے مسئلے آچکے ہیں جن میں دونوں کو دلچسپی ہے اور جنہیں ہمسائگی کے اصولوں پر حل ہونا چاہئے۔ جنگ کے بعد کے زمانے میں سب سے پہلا فیصلہ طلب سوال برما میں ہندوستانیوں کے بسنے کا ہوگا۔ اگر ایک طرف ہندوستانی سرمایہ داروں کے ہاتھوں برمی لوگوں کے ناجائز استعمال کو ختم کرنا ہوگا، تو دوسری طرف اس کی امید کی جائے گی کہ اپنے ملک میں بسنے والے ہندوستانیوں کے بارے میں برمی باشندے وسعت نظر اور فراخدلی سے کام لیں۔ ہندوستان کی عزت نفس کا تقاضا ہے کہ اس بات کا پورا پورا انتظام کر دیا جائے کہ وہ ہندوستانی جو ایک زمانہ سے برما میں بس گئے ہیں اس ملک کے مواقع سے مناسب اور منصفانہ فائدہ اٹھا سکیں۔ دونوں ملک ایک دوسرے کی خدمت کر سکتے ہیں، اور ایک دوسرے پر منحصر ہیں۔ ہندوستان پٹرول

چاول، اور لکڑی کے بارے میں برما پر منحصر ہے، تو دوسری طرف برما خود کو ترقی دینے اور مشرق کی طرف سے حملے کی صورت میں ایک مشترکہ بچاؤ کی پالیسی بنانے میں ہندوستان کی مدد حاصل کر سکتا ہے۔ انیسویں صدی میں ہندوستانی فوجوں نے برما کو فتح کیا تھا اور برما کی دو لڑائیوں کا پورا بار ہندوستان ہی کو برداشت کرنا پڑا تھا۔ موجودہ لڑائی میں برما کے ہاتھ سے نکل جانے سے ہندوستان کی سلامتی کے لئے خطرہ پیدا ہو گیا۔ برما سے پسپائی کے سلسلہ میں ہندوستان کو جان اور مال کا بھاری نقصان اٹھانا پڑا۔ برما پر جاپانیوں کا قبضہ ہو جانے سے ہندوستانی تخلیہ کنندگان کو جن مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا اسے ہندوستان بہت زمانہ تک نہیں بھول سکتا۔ ہندوستان یہ ہرگز گوارا نہیں کر سکتا کہ اس کی مشرقی سرحدوں پر جاپانی پھر کوئی حملہ کریں، اس لئے وہ سمندر اور خشکی دونوں راستوں سے آئندہ برما کے بچاؤ کی ذمہ داری لینے کے لئے آمادہ ہو جائے گا۔ اس بارے میں دونوں ملکوں کے باہمی تعاون کی تفصیلات تو آگے چل کر طے ہوں گی، سردست جو انتظام ممکن نظر آتا ہے وہ یہ ہے کہ ان دونوں ملکوں کے وسائل اکٹھا کر لئے جائیں گے، اور آئندہ چل کر مشترکہ دلچسپی کے تمام مسئلوں کے بارے میں دوستی اور ہمسائگی کی اسپرٹ میں سمجھوتا ہو جائے گا۔ ہندوستان کو برما کی آزادی میں ہمیشہ دلچسپی رہیگی اور چونکہ جنگ کے بعد دونوں ملک ڈومی نین کا درجہ رکھیں گے اس لئے ان میں آپس میں گہری مفاہمت پیدا ہو جائے گی۔ ہمیں نہ بھولنا چاہئے کہ جب برما ہندوستان سے الگ کیا گیا تو خود اس ملک میں رائے عامہ کا ایک کافی حصہ اس عمل کے خلاف تھا۔ دونوں طرف سے نیک خواہی اور یگانگت کی اس روشن علامت سے فائدہ اٹھانا چاہئے اور خاص طور پر امن اور

سلامتی کے بارے میں گہرے تال میل کی بنیاد پر ان دونوں ملکوں کو ایک دوسرے کے قریب لانا چاہئے۔

ملایا

ملایا میں پنانگ اور سنگاپور یہ دونوں مخلوط قسم کے اور جدید طرز کے حصے ہیں جو صدیوں کے برطانوی تعلق اور تجارت کی وجہ سے پیدا ہوئے۔ ان کے علاوہ مسلمان سلطانوں کے نو علاقے ہیں جہاں کی زندگی اور اداروں پر آج کل کی کاروباری دنیا کے حالات کا ذرا بھی اثر نہیں پڑا ہے۔ روسیوں کی حکومت کے برخلاف، پچھلے زمانہ میں برطانوی حکومت کا اصول ہمیشہ یہ رہا ہے کہ جو ممالک اس کے زیر اثر ہیں اس کے باشندوں کی سادہ زندگی میں کم سے کم مداخلت کی جائے، جدید تہذیب کو آہستہ آہستہ پھیلنے دیا جائے اور عارضی ذریعوں سے تعلیم کی رفتار تیز کرنے کی بجائے اسے رفتہ رفتہ بڑھنے دیا جائے۔ ملایا میں برطانوی طاقت کی اب تک، خود ملک کی طرف سے کوئی موثر مخالفت نہیں ہوئی ہے، لیکن اس جنگ سے برطانوی حکومت کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ اس ملک کو جلد سے جلد نئے زمانہ کے رنگ پر لانا کتنا ضروری ہے، اور ہندوستان ملایا کے اس تجدد سے اتنا ہی خوش ہو گا جتنا کہ دولت عامہ کے اندر برطانوی آزادی پسندی (لبرلزم) کی اور دوسری علامتوں سے۔

خود ملایا کے اصلی باشندے اپنے ملک میں اقلیت میں ہیں ان کی تعداد ۲۲ لاکھ ہے۔ لیکن پچھلی مردم شماری کی رو سے چینیوں کی تعداد ۲۳ لاکھ ہے۔ ہندوستانی جمعیت بھی خاصی یعنی ساڑھے سات لاکھ ہے۔ چینیوں کے متعلق جو عجیب و غریب بات ملایا میں دیکھنے میں آتی ہے، وہ برطانوی سلطنت

کے کسی دوسرے حصہ میں نظر نہیں آتی۔ یعنی یہ کہ وہاں یہ لوگ چینی اور برطانوی دونوں قومیتوں کا حق رکھتے ہیں اور غالباً اسی وجہ سے ان میں سے اکثروں کی دل چسپی ملایا کے ساتھ اتنی نہیں ہے جتنی کہ چین کے ساتھ۔ ہندوستانی آبادی میں زیادہ تر تامل قلی ہیں جو ربر کے باغات میں کام کرتے ہیں، اور ایک مختصر سی تعداد پیشہ ور لوگوں اور قرض کا کاروبار کرنے والے ساہوکاروں کی بھی ہے، لیکن بدقسمتی سے اسے وہاں وہ حیثیت حاصل نہیں ہے جو چینیوں کو ہے۔ برما کی طرح ملایا کے ساتھ بھی ہندوستان کی دل چسپی زیادہ فوجی اغراض کی وجہ سے ہے ۱۹۴۲ء میں۔ سنگاپور کا ہاتھ سے نکل جانا اس کے دفاعات کی کمزوری کی وجہ سے نہیں بلکہ اسلئے ہوا کہ اس کے بچاؤ کے لئے کافی فوجیں نہیں تھیں۔ سنگاپور کا بحری مرکز اب بھی پوربی سمندروں کی اور اسی طرح خود ہندوستان کی سلامتی کی کنجی بن سکتا ہے۔ اگر اس کی اہمیت کو پوری طرح نہ سمجھا گیا تو آئندہ زمانہ میں یہ ہندوستان کے لئے اس سے بھی بڑی مصیبت کا باعث ہوگا جتنا کہ ۱۹۴۲ء میں اس کا ہاتھ سے نکل جانا۔

سیام

سیام اگرچہ ایک چھوٹا سا ملک ہے اور اس کے باشندے بھی نرم مزاج اور مرنجاں مرنج ہیں لیکن اس میں اندرونی طور پر ایک ایسی مضبوطی پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے ان حالات میں بھی جن میں دوسری ریاستیں ختم ہو جاتی ہیں سیام پنپتا رہتا ہے۔ یہ ملک ایک قدیم شاہی سلطنت ہے لیکن اس پر سیاست دانوں کا ایک گٹھ حکومت کرتا ہے۔ موجودہ بادشاہ چکری خاندان سے تعلق رکھتا ہے اور پوری سیاسی آبادی

میں اسے جو قوت اور اقتدار حاصل ہے اس پر پچھلے پندرہ سال کے واقعات کا ذرا بھی اثر نہیں پڑا ہے۔ شہنشاہیت میں دستورپسندی کے اجزا کے شامل ہو جانے سے اگرچہ مطلق العنان حکومت کا خاتمہ ہو گیا ہے، لیکن بادشاہ کے وقار میں کوئی فرق نہیں آیا ہے، ۱۹۳۲ء کے انقلاب کے بعد شروع کے چند سالوں میں۔ جنہیں آزادی پسندی کی منزلیں کہنا چاہیئے۔ نہ صرف سیام کی شاہی استبداد کی روایات سے پاک ہو گئی، بلکہ اسے شاہی خاندان کی اس دھڑے بندی سے بھی نجات مل گئی جو سلطنت کے بڑے بڑے عہدوں کی اجارہ دار بن گئی تھی۔ موجودہ بادشاہ آنند ماہی ڈول ابھی نابالغ ہے، اور چونکہ مارشل پی بل سونگرام کی پالیسی کے ساتھ، جو ڈکٹیٹر بن بیٹھا تھا اسے کسی قسم کا بھی لگاؤ نہیں ہے اس لئے کیا عجب ہے کہ لڑائی کے بعد بادشاہ کی ذات قوم کی نئی زندگی کا مرکز بن جائے۔ باہر کی دنیا کو سیام کے اندرونی واقعات کا جو کچھ علم ہے اس سے یہی پتہ چلتا ہے کہ ایک چھوٹے فوجی گٹ کے علاوہ جو ابھی کچھ دن ادھر تک حکومتی نظام پر قبضہ جمائے ہوئے تھا، سیام کی آبادی لڑائی سے بے تعلق بلکہ ایک حد تک جاپانیوں کی مخالف ہے۔ اگر جمہوریتیں کے خلاف اعلان جنگ کرنے والوں کی معافی کا کبھی سوال پیدا ہو تو سیام اس معافی کا زیادہ حقدار ہے۔ یہ چھوٹا سا ملک جسے نہ برطانیہ سے فوجی ساز و سامان مل سکتا تھا اور نہ امریکہ سے، بالکل بے بس ہو گیا تھا۔ اس لئے بار بار ہوائی جہازوں اور پٹرول کے لئے التجائیں کیں جو منظور نہ ہو سکیں۔ اِدھر تو اتحادی کسی طرح اس کی مدد کرنے کے قابل نہ تھے، اُدھر سے جاپان نے اس کے اندرونی اور بین قومی معاملات میں دخل دینا شروع کر دیا اور آخر میں اس سے کہہ دیا کہ یا تو اتحادیوں کے خلاف جنگ کا باقاعدہ اعلان کر دو یا پھر اپنی ہستی سے

ہاتھ دھو بیٹھو۔

جنگ کے بعد سیام کے سامنے اور مسئلوں کے علاوہ بڑا مسئلہ اس کی چینی آبادی کا ہوگا، جس کی تعداد ۲۵ لاکھ ہے۔ چینی آبادی کی صحیح گنتی مشکل ہے اس لئے کہ مشرق کے ملکوں میں سیام ہی ایسا ملک ہے جس نے چینیوں کو اس طرح اپنا لیا ہے کہ کسی شخص کے بارے میں یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ چینی ہے یا تائی! سیام کے جیسے چھوٹے ملک کو ہمیشہ اپنے پڑوسی چین کے دباؤ کا ڈر اور چینی پھیلاؤ کے ریلے کا خطرہ رہیگا۔ سیام اب تک محض بعض سخت تدابیر کی وجہ سے، خاص کر چین کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کرنے سے انکار کر کے چینی آبادی کے دباؤ کی روک تھام کر سکا ہے۔

سیام کی تہذیبی روائتیں ہندوانہ ہیں اور ہندوستانیوں کی اس دیس میں بڑی عزت ہے۔ لیکن سیام کے ساتھ ہندوستان کی خاص دلچسپی اپنے بچاؤ کے سلسلہ میں ہے اور اس حیثیت سے سیام کی وہی پوزیشن ہے جو ملایا یا ہند چین کی۔ ہندوستان سیام کو ہمیشہ ایک حجابی (بفر) ریاست سمجھتا رہا ہے۔ سیام کے ہاتھ سے نکل جانے کی وجہ سے برما گیا۔ اور برما کے ہاتھ سے نکل جانے کی وجہ سے ہندوستان کی پوربی سرحد دشمن کے حملے کے لئے کھل گئی۔ اسی لئے ہندوستان کے لئے ضروری ہے کہ جس طرح بھی ممکن ہو سیام کو غیر ملکی فوجی اثر سے پاک رکھا جائے اور اسے اس کی ترغیب دی جائے کہ اپنے بچاؤ کے انتظامات کو ہندوستان کے ساتھ مربوط کرے۔ اس کے بدلے میں سیام کو چاہیئے کہ پورب جانے والی ہندوستانی ہوائی لائنوں کو اپنے ملک کے اوپر سے بے روک ٹوک جانے

دے اور چونکہ برما اور ملایا کے درمیان ریلوے سلسلہ بھی مکمل ہوگیا ہے اسلئے ریلوے ٹریفک کے لئے بھی راستہ دے۔ بین الاقوامی غلط فہمیوں کی روک تھام اسی صورت میں ہوسکتی ہے جب یہ سمجھ لیا جائے کہ خود مختار ہندوستان اپنی حفاظت چوکسی کے ساتھ کرے گا اور اپنے چھوٹے ہمسایوں کے ساتھ مضبوط معاشی اور تجارتی تعلقات قائم کرکے انہیں بھی اپنی وحدت قائم رکھنے میں مدد دے گا۔

ہند چین

فرانسیسی ہند چین میں اگر تھوڑی بہت جغرافی یا انسانیاتی وحدت یا سیاسی رابطہ پایا جاتا ہے تو وہ صرف فرانسیسی حکومتی نظام کا پیدا کیا ہوا ہے۔ ویسے یہ چیزیں وہاں موجود نہیں ہیں۔ ہند چین قوموں اور تہذیبوں کا ایک معجون مرکب ہے۔ آج کل یہ پانچ حصے اس کے ترکیبی اجزا ہیں:۔ (۱) انام کی سلطنت (۲) کمبوڈیا کی سلطنت (۳) لاوس اور (۴) ٹونکن۔ جو دونوں حفاظتی راج میں ہیں۔ اور (۵) کوچن چین کی نو آبادی۔ مادی ترقیوں کے اعتبار سے فرانسیسیوں کا [illegible] قابل قدر رہا ہے۔ انہوں نے ریلیں، سڑکیں، سمندری پشتے اور آبپاشی کی نہریں بنائیں اور اعلیٰ تعلیم پھیلائی، اور مشرقی علوم اور فن آثار قدیمہ کو ترقی دینے کی کوشش کی۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہنا پڑتا ہے کہ بعض حیثیتوں سے فرانسیسیوں کی حکومت نہ صرف آزادی کی مخالف بلکہ لوٹ کھسوٹ کی حکومت رہی ہے۔ انام کے قومیت پسند متوسط طبقہ کی طرف سے اس کی کافی مخالفت کی گئی ہے۔ اس کے مقابلہ میں کمبوڈیا والوں نے آسانی سے بدیسی راج کو قبول کرلیا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ فرانس نے کمبوڈیا کو انام اور سیام کے لگاتار حملوں سے بچایا اور وہاں کے بودھ سادھوؤں

کو راضی کر لیا ہے۔

انام والوں کی تہذیب چینی ہے:۔ دو ہزار سال تک انام کی سلطنت، چینی سلطنت کی باجگذار رہ چکی ہے۔ اس کی زبان اگرچہ چینی نہیں ہے۔ لیکن فرانسیسی حکومت کے دور دورہ تک چینی حروف میں لکھی جاتی رہی ہے۔ اس کے راج میں جسے فرانسیسیوں نے باقی رکھا ہے جو درباری رسمیں اب تک چلی آتی ہیں وہ پیکن کے راج دربار کی ہوبہو نقل ہیں۔ اس کے برخلاف کمبوڈیا کی تہذیب ہندوستانی ہے۔ کمبوڈیا ان ہندو ریاستوں میں سے آخری ریاست ہے جو کسی زمانہ میں اس سارے علاقہ پر حکومت کرتی تھیں اور اس کی راج ریتیں جو نری ہندوانہ ہیں پانچویں صدی عیسوی سے چلی آرہی ہیں۔

ہندچین کے ساتھ ہندوستان کی دلچسپی صرف بچاؤ کے نقطہ نظر سے ہے۔ ہندچین ہی سنگاپور کا حفاظتی گڑھ ہے۔ کمرانہ کھاڑی میں ایک ایسے سمندری اڈے بننے کی ساری قدرتی صلاحیتیں موجود ہیں جس سے جنوبی چین کے سمندروں پر قابو رکھا جا سکے، اگرچہ ابھی اسے پوری طرح ترقی نہیں دی گئی ہے۔ اس لئے ہندوستان کے بچاؤ کے لئے یہ ضروری ہے کہ یا تو کمرانہ کھاڑی پر کسی ایسی طاقت کا قبضہ ہو جو پوری طرح ہندوستان کی دولت ہو یا پھر وہ کسی ایسی ریاست کے پاس ہو جو سمندری پھیلاؤ کی ہوس سے خالی ہو۔ اس لئے ہندوستان کا اپنا فائدہ اسی میں ہے کہ وہ ہندچین کی خود اختیاری پر زور دے یا اس کے مختلف اجزا کے کسی ایسے وفاق پر زور دے جو بیرونی طاقتوں کی دخل اندازی سے محفوظ ہو، اور اگر ضرورت سمجھی جائے

توکسی بین الاقوامی ادارے کی نگرانی اور اہتمام میں ہو۔

ڈچ مشرقی ہند

جنوب مشرقی ایشیا کے تمام ملکوں میں ہندوستان کے دلی اور تہذیبی تعلقات ڈچ مشرقی ہند کے ساتھ سب سے زیادہ گہرے ہیں۔ وہاں کی تہذیب ہندوانہ ہے اور ہند و ہندوستان کے لئے خاص کشش رکھتی ہے، دوسری طرف وہاں کی آبادی زیادہ تر مسلمان ہے اور مسلم ہندوستان اس کے ساتھ مذہبی لگاؤ رکھتا ہے۔ موجودہ لڑائی نے ثابت کر دیا ہے کہ اس علاقہ پر کسی دشمن طاقت کا قبضہ ہندوستان کی پوربی سرحدوں کے لئے سخت خطرناک ہے۔

ڈچ شرقی ہند کی قدرتی دولت ضرب المثل ہے۔ موجودہ لڑائی سے ڈچ حکومت کو یہ سبق لینا چاہیئے کہ جب تک وہ یہاں کی دیسی آبادی کو حکومت خود اختیاری حاصل کرنے میں مدد نہ دے گی وہ اپنے ملک اور اس کی قدرتی دولت کی حفاظت کرنے کے قابل نہ ہوسکیں گے۔ اس ملک میں قومی تحریک خاصی زوردار ہے اور جنگ کے بعد ہندوستان کی طرف سے اس کی ہمدردی اور تائید ضرور ہوگی۔ ڈچ شرقی جزائر ہند کے باشندوں کے ساتھ ڈچ حکومت کے تعلقات آئندہ جو کچھ بھی ہوں اتنی بات ضرور ہے کہ ہندوستان کسی مخالف یا سامراجی طاقت کو۔ خواہ وہ پوربی ہو یا پچھمی۔ آئندہ ڈچ شرقی جزائر ہند میں قدم جمانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ اس ملک کا مستقبل ہندوستان کے لئے بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ آسٹریلیا کے لئے اور ان دونوں ملکوں کو چاہیئے کہ

آپس میں مل کر اس علاقہ کے متعلق ایک مشترکہ پالیسی بنالیں۔

یہ ہیں ہندوستان کے وہ خاص خاص مفادات جو ان ملکوں سے وابستہ ہیں۔ اس پورے علاقہ کے ساتھ مجموعی طور پر ہندوستان کے جو مفادات وابستہ ہیں انہیں مختصراً کس طرح پیش کیا جائے؟ اس مختصر سی مدت کو چھوڑ کر جب کہ انگریزوں کے دلوں میں ایک طرح کا خوف، اور وہ بھی بے جا خوف، موجود تھا کہ کہیں فرانس اپنے ہند چینی مقبوضات کو اڈے کے طور پر استعمال کر کے اپنی اس شکست کا بدلہ لینے کی کوشش نہ کرے جو اسے ہندوستان میں ایک صدی پہلے کھانی پڑی تھی ہندوستان کے مشرقی پڑوسیوں کے مسئلہ پر، بہ نسبت اس کے مغربی ہمسایوں کے بہت کم توجہ کی گئی۔ اب تک سرکار ہند کو اپنی مشرقی سرحد کے اس پار ملکوں کے ساتھ کسی قسم کی دل چسپی نہیں تھی، جس کی خاص وجہ یہ تھی کہ اسے اپنے چھوٹے چھوٹے ہمسایوں سے کوئی خطرہ نہ تھا، اور ان سے ساز باز کرنے والی کوئی بڑی دولت بھی ان کی پشت پر موجود نہ تھی۔ ہندوستان اور چین کے درمیان اور سیام اور برما کے درمیان پہاڑوں کی موجودگی، سنگاپور میں جاپان کو روکنے کے لئے سمندری آڑ، اور اس طویل المدت منصوبہ بندی اور بیگانگی کی طرف سے کامل بے توجہی جو جاپان کی دست درازی سے پہلے جاری تھی۔ ان سب باتوں نے سرکار ہند کو بالکل بے فکر اور بے نچنت بنا دیا تھا۔ اپنے محفوظ ہونے کے بارے میں سرکار ہند کا یہ یقین کتنا گہرا تھا، اور کتنی دیر تک باقی رہا اس کا کچھ اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ۱۹۳۷ء میں جب انڈو۔ برما (ہندی۔ برمی) ریلوے بنانے کا سوال زیر غور آیا۔ تو اس کے خلاف فیصلہ کیا گیا۔

لیکن اب آنکھیں کھُل گئی ہیں۔ ۱۹۴۲ء کے وسط میں جاپان کے ہاتھوں ہند چینی کی تسخیر ہی کی وجہ سے چھ مہینے بعد سیام ہاتھ سے نکل گیا، اور ان دونوں کے ہاتھ سے جاتے رہنے کی وجہ سے ملایا کا سقوط ہوا، اور برما کے ہاتھ سے نکل جانے کی وجہ سے ہندوستان کو ایسا شدید خطرہ درپیش ہو گیا جو ایک صدی کے اندر نہ ہوا تھا۔ جاپان کی فوج اور بیڑے نے اب شکی مزاج سے شکی مزاج شخص کو بھی یہ جتا دیا ہے کہ ہندوستان کا مفاد کس چیز میں ہے۔

اس لڑائی کے خاتمہ پر جاپان کو ضرور شکست ہو گی اور اس کی سامراجی جدوجہد اگر بالکل ناممکن نہیں تو خلاف قیاس ضرور ہو جائے گی۔ کیا اس وقت ہندوستان اپنے کو خطرے میں ڈالے بغیر پھر اپنی پرانی بے پروائی اور بے تعلقی کی پالیسی پر عمل کر سکے گا؟ اس سلسلہ میں ہمیں اس مکان کا قصہ یاد رکھنا چاہئے جس میں سے اگر ایک بھوت نکال باہر کیا جاتا تھا تو سات اس سے بھی بدتر بھوت اندر داخل ہو جاتے تھے۔ کچھ اور طاقتیں بھی اس علاقہ کے مستقبل کے ساتھ دلچسپی ظاہر کر رہی ہیں، اور اگرچہ ان کی پالیسی اب تک کسی قدر ڈھلمل اور غیر یقینی ہے لیکن ان کا رُخ ایسا ہے کہ اگر ان کی تائید پر قوت موجود ہو جائے تو وہ ہندوستان کے لئے کسی قدر پریشان کن بن جائیں گی۔ ہندوستان کی حفاظت کا تقاضہ ہے کہ پہلے اس علاقہ کی حفاظت کا انتظام کیا جائے اور اس علاقہ کی حفاظت کے لئے ہندوستان، آسٹریلیا، اور سلطنت متحدہ میں گہرے اشتراک عمل کی ضرورت ہے۔ اس اشتراک عمل کی ایک مناسب صورت یہ ہو سکتی ہے کہ جنوب مشرقی ایشیا میں ایک علاقہ واری تنظیم قائم کی جائے۔

چین کے اس پار امریکہ موجود ہے جو جنوب مشرقی ایشیاء کی آئندہ حفاظت کے ساتھ دل چسپی کا اظہار کر رہا ہے۔ ممکن ہے کہ امریکہ کی اپنی پالیسی غیر یقینی ہو "تنہا پسندی" کی پالیسی کی طرف عود کر کے ممکن ہے کہ امریکہ جنوب مشرقی ایشیاء کی حفاظت میں عملی طور پر شرکت نہ کرے، لیکن اگر امریکہ کو دنیا کے کسی حصہ کے ساتھ دل چسپی ہو سکتی ہے تو وہ حصہ پیسفک سمندر (بحرالکاہل) کا ہے، اور اگر یہ دل چسپی پیدا ہوئی تو اس کی وجہ تجارت اور کاروبار اور خاص طور پر اس علاقہ میں امریکہ کی حیثیت کو محفوظ اور مضبوط بنانے کی خواہش ہوگی۔ ہندوستان کو امریکہ پر بھروسہ ہے اور اسے امریکی غلبہ کے ہونے کا کوئی ڈر نہیں ہے، لیکن ساتھ ہی یہ کہنا کہ اگر امریکہ ان دوسری طاقتوں کی ہمت افزائی کرے جو پاؤں پھیلا کر اس علاقہ میں مداخلت بے جا کرنا چاہتی ہیں تو بھی ہندوستان کو کسی قسم کا خوف و ہراس نہ ہوگا۔ اپنے آپ کو دھوکا دینا ہے۔

مشرق وسطےٰ کی طرح اس علاقہ کی سفارتی مصلحتیں بھی آگے چل کر سرخی ہوں گی، یعنی امریکہ، چین اور ہندوستان (برطانوی دولت مشترکہ کے اندر رہکر) یہ تینوں خاص خاص شریک کار رہوں گے۔ لیکن ہندوستان اب زیادہ وقت ضائع نہیں کر سکتا۔

اسے مشرق میں بھی اپنی حیثیت اتنی ہی با اثر بنا لینی چاہئے جتنی کہ مغرب میں ایران اور افغانستان میں ہے۔ اس سلسلہ میں پہلا قدم یہ ہونا چاہئے کہ اس پورے علاقہ میں ہندوستان کی سفارتی نمایندگی کا انتظام کیا جائے۔ اس علاقہ کے ساتھ ہندوستان کا جو اہم مفاد وابستہ ہے اس میں ہندوستان، نیز باہر کے ملکوں کو خاص دل چسپی ہے، اور کوئی

بھی ہندوستانی حکومت ہو وہ اس دل چسپی کو اور بڑھانے کی کوشش ضرور کرے گی۔ ہندوستان کو ہمیشہ چوکس رہنا چاہئے اور اگر دوسری طاقتیں اس کے متعلق غلط شبہات پیدا کریں تو فوراً ان کی اصلاح کرنی چاہئے۔ ہندوستان کے صنعت کار بجا طور پر یہ امید کر سکتے ہیں کہ جاپانیوں کے نیست و نابود ہو جانے کے بعد ان ملکوں میں جو تجارتی منڈیاں کھل جائیں گی وہ انہی کے ہاتھ آئیں گی۔ ہندوستانی روپیہ لگانے والوں کو اپنے سرمایہ کے پرمنفعت استعمال کا موقع ہاتھ آسکے گا۔ مشرقی ہوائی راستوں کے بارے میں ملک معظم کی حکومت کے جو منصوبے بھی ہوں ہندوستان کو ان کے ساتھ بہت کچھ دل چسپی ہوگی اور ان کے چلانے میں وہ بھی اپنا مناسب اور مستحقہ حصہ طلب کرے گا۔ ہندوستان کا بچاؤ اور جنوب مشرقی ایشیا میں اس کے تجارتی مفادات کی تحریک اور ان کی بقا صرف انہی اقدامات پر منحصر ہے۔

چھٹا باب

چین، روس اور امریکہ

پچھلے باب میں جن مسئلوں پر بحث کی گئی ہے اگر ان کا مقابلہ ان زبردست مسائل سے کیا جائے کہ آنے والی دنیا پر جن طاقتوں کی حکمرانی مقدر ہو چکی ہے ان کے ساتھ ہندوستان کے تعلقات کیا ہونے چاہئیں تو معلوم ہو گا کہ پچھلے باب کے مسائل بالکل محدود اور مقامی نوعیت کے تھے۔ ان دیو پیکر طاقتوں کے ساتھ اپنے تعلقات کی ترتیب ہندوستان کے لئے ازبس لازمی ہے ان کے ساتھ اشتراکِ عمل کے طریقہ کا تعین اتنا اہم سوال ہے کہ شاید اس سے زیادہ اہم اور نازک مسئلہ ہندوستان کی خارجہ پالیسی کے پورے احاطہ میں مشکل ہی سے ملے گا۔ آیئے اب اِن واقعات کی چھان بین کریں جن کی بنا پر ان سلطنتوں میں سے ہر ایک کے ساتھ ہندوستان کے رویہ کا تعین ہو گا۔

چین

ہندوستان اور چین کی باتوں میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ دونوں کثیر آبادی رکھتے ہیں۔ ان کی ملی جلی آبادی دنیا کی کل آبادی کا ½ حصہ

ہے۔ لڑائی کے بعد دونوں ملکوں کو تعمیر جدید کے بڑے پیمانے کے پروگرام بنانا ہوں گے۔ دونوں ملکوں کی تاریخ اندرونی اختلافات سے پُر ہے۔ دونوں کے معاشی نظام میں زراعت غالب ہے۔ اور اب دونوں ایک مشترکہ دشمن یعنی جاپان کا سامنا کر رہے ہیں۔ اگرچہ ان کا کلچر ایک دوسرے سے بہت مختلف ہے پھر بھی ایک کا اثر دوسرے پر پڑا ہے۔ ہندوستان بدھ مت کی جنم بھومی ہے جو چین کے نمایاں مذہبوں میں سے ہے۔ چینی مسلمانوں نے چینی کلچر اور چینی تصوراتی نظام کو اپنے اندر جذب کر لیا ہے۔ گذشتہ صدی میں دونوں ملکوں کو مغربی خیالات کے تصادم کے ساتھ تطابق کرنا پڑا ہے، اور دونوں کی یہ خواہش رہی ہے کہ ان کی نئی نسلیں مغربی تہذیب کی تمام اچھی باتوں کو اپنے اندر سمولیں، لیکن اپنی روایتوں سے بالکل دست بردار نہ ہو جائیں۔

ہندوستان اور چین دونوں کبھی کسی بڑے جھگڑے میں نہیں اُلجھے ہیں۔ جب جاپان نے چین پر حملہ کیا تو ہندوستان ہی سب سے پہلا ملک تھا جس نے ایک غیر سرکاری طبی وفد بھیجکر چین کے ساتھ اپنی عملی ہمدردی کا ثبوت دیا، اور وہ بھی اس وقت جب کہ مغربی طاقتیں ہنوز جاپان کو راضی رکھنے کی پالیسی پر کاربند تھیں۔ موجودہ لڑائی میں چینی اور ہندوستانی فوجیں شانہ بہ شانہ لڑی ہیں۔ ہندوستان چین کو ہوائی اور خشکی کے راستہ رسد بھیجنے کا مرکز بن گیا ہے۔ تبت اور برما کے اندر سے نئی شاہراہیں کھولی جا چکی ہیں اور چین کو جانے والی موجودہ ڈاک کی سڑک جو گلگت اور سنکیانگ ہو کر جاتی ہے، ہندوستان کے اندر سے گزرتی ہے چینی طلبا تعلیم اور تربیت کی غرض سے ہماری یونیورسٹیوں میں آئے ہیں،

اسی طرح سے ہندوستانی طلبا چین بھیجے جا چکے ہیں۔

مقاصد اور نصب العین کی یہ ہم آہنگی ان دونوں ملکوں کے درمیان پائیدار رشتہ دوستی قائم کرنے میں بنیاد کا کام دے سکتی ہے۔ جنگ کی وجہ سے ہندوستان کے لئے چین سے تجارت کرنے میں اور اس ملک کو صنعتی بنانے میں امداد دینے کے نئے مواقع پیدا ہو گئے ہیں۔ ان دونوں ملکوں کے مقدر کا تقاضہ یہی ہے کہ چین اور ہندوستان آپس میں مل جل کر ایشیا کی حفاظت کے لئے ایک مشترکہ منصوبہ بنائیں۔ دونوں ملکوں کی اس ہم آہنگی سے فوجوں میں کفایت ہوگی۔ ان دونوں ملکوں کے مدبروں کا یہ کام ہوگا کہ وہ ایسا انتظام کریں کہ آپس کے بعض اختلافی مسائل مثلاً تبت کا مسئلہ، سنکیانگ کی تجارت اور جنوب مشرقی ایشیا میں ہندوستان کے ہمسایوں کی خود مختاری یہ چین اور ہندوستان کے درمیان اس تعاون میں حائل نہ ہوں جو امن عالم کے لئے ازبس ضروری ہے۔

روس

جنگ سے پہلے روس ہندوستان کے لئے ایک سربستہ راز تھا، اگرچہ ہندوستان کی آبادی کے بعض حصے تصوراتی حیثیت سے روسی افکار و خیالات کی طرف مائل تھے، لیکن عام طور پر مغربی ملکوں کی طرح ہندوستان کے لئے بھی روس ایک بھید اور معمّا تھا۔ جرمنی کے روس پر حملہ کرنے سے یہ پردہ راز اٹھ گیا۔ روسیوں نے جس پامردی سے جرمن مار دھاڑ کا مقابلہ کیا، پوری قوم اسٹالن کے گرد جمع ہو گئی اور روس کے سرباشندے نے زیادہ سے زیادہ قربانی سے دریغ نہ کر کے پہلے جرمن یلغار کو روکا

اور پھر اسے پسپائی میں تبدیل کر دیا۔ ان سب باتوں نے دنیا کی آنکھیں کھول دیں۔ اب ہماری سمجھ میں آتا جارہا ہے کہ پچھلے ۲۵ برس میں روس نے اکثر ایسے مسئلوں کو جو آج بھی ہندوستان میں نازک ترین مسئلے بنے ہوئے ہیں کس طرح حل کیا۔ ان میں سے خاص خاص مسائل یہ ہیں:۔ خواندگی کی اشاعت، رہائش، غذا اور حفظان صحت کے انتظامات، صنعتی ترقی، زراعت اور صنعت کا توازن، اور مختلف علاقوں کے مقامی قومی گروہوں کا ایک مرتب شکل میں اس طرح انضمام کہ ساتھ ہی ان میں سے ہر ایک کی ثقافتی وحدت بھی قائم رہ سکے ان تمام باتوں نے سوویٹ تصوراتی نظام میں ایسی جاذبیت پیدا کر دی ہے کہ اس کا اثر اس ملک کی اندرونی سیاست پر ضرور پڑ کر رہیگا۔ اب تک ہندوستان میں گروہوں کی تقسیم مذہبی اور سماجی اختلافات کی بنا پر ہوتی آئی ہے۔ لیکن اب اور خاصکر نئی نسل میں یہ تقسیم تصوراتی بنیادوں پر ہوتی جا رہی ہے۔

ان باتوں کے باوجود، اور باوصف اس امر کے کہ روس اور ہندوستان کی سرحدیں ملی ہوئی ہیں اور ہندوستان نے روس کو جنگی ذخائر بھیجنے میں نمایاں حصہ لیا ہے، روس کے حالات زندگی اور نظم معیشت کی تفصیلوں کے بارے میں اب تک یہاں ناواقفیت بدستور باقی ہے۔ اسی طرح، معلوم ہوتا ہے کہ روس کو بھی ہندوستان کے اصلی حالات کے بارے میں کوئی واضح علم نہیں ہے۔ مختصر یہ کہ تبادلہ معلومات اور بہتر مفاہمت پیدا کرنے کے سلسلہ میں ابھی دونوں ملکوں میں بہت کچھ کام ہونا باقی ہے۔

جب لڑائی ختم ہو جائیگی تو فضائی سفر کی وہ زبردست ترقیاں جو روس میں ہوئی ہیں تجارتی اور زمانہ امن کے اغراض کے لئے استعمال ہونگی طویل اور عریض روسی علاقوں میں بڑی بڑی ہوائی لائینیں کام کرنا شروع

کردیں گی۔ اگر روس اپنی تجارتی ہوائی لائنوں کو جنوب کی طرف پھیلانے کا تصفیہ کرے تو اس سے ہندوستان کو بھی موقع ملے گا کہ وہ اپنی تجارتی لائنیں روس کے تجارتی مرکزوں تک لے جائے۔ اس طرح دونوں ملکوں کے لئے تجارتی ہوابازی اور باہمی تجارت کے لئے زبردست شاہراہیں کھل جائیں گی، کم از کم بقیہ ایشیار کی تجارت میں دونوں کو دلچسپی رہے گی۔

شمالی ایشیار میں روس کی نگرانی میں حفاظتی اغراض کے لئے جو انتظامات بھی کئے جائیں گے ان کی بنا پر جنوبی ایشیار کے لئے بھی ویسے ہی انتظامات زیر غور یا بروے کار آئیں گے اور ان کا خاص مرکز یہ ملک (ہندوستان) ہی ہوگا۔ مشرق وسطےٰ اور افغانستان میں جو کچھ سفارتی پالیسی روس کی ہوگی اس کے جواب میں اور دیسی ہی مشترکہ ہندوستان کی اور انگریزی پالیسی بھی ان علاقوں میں ہوگی اور پھر امریکہ کے مفادات بھی ان ملکوں کے ساتھ ضرور وابستہ ہوں گے۔ امید کی جاتی ہے کہ ان ملکوں کے درمیان جو ہم آہنگی اور تال میل لڑائی کی وجہ سے پیدا ہوگیا ہے وہ امن کے زمانہ میں بھی جاری رہیگا روس کے ساتھ برطانیہ کا ۲۰ سالہ معاہدہ دوستی ہندوستان پر بھی عائد ہوتا ہے، غرض کہ ہندوستان کا فرض ہے کہ وہ اپنے اس زبردست ہمسایہ (روس) میں روز افزوں دلچسپی لے، ان دونوں ملکوں کی دوستی عرصہ دراز تک ایشیار کی حفاظت کا ایک اہم عنصر بنی رہے گی۔

امریکہ

خود امریکی اس بات کے تسلیم کرنے میں دوسروں سے پیش پیش ہیں کہ ان کے ملک کی خارجہ پالیسی تضاد سے خالی نہیں ہے آج معاملات عالم

پر امریکہ کا اثر بہت گہرا اور زبردست ہے۔ اگرچہ امریکی روایات شہنشاہیت کے خلاف ہیں، لیکن ساتھ ہی یہ بھی واقعہ ہے کہ امریکی علاقوں کے بڑے بڑے حصے جن طریقوں سے حاصل کئے گئے وہ پرانی سامراجی طاقتوں کے طریقوں سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھے۔ ابھی یہ دیکھنا ہے کہ فلپائنز کا مسئلہ بھی خوشگوار طریقہ پر طے ہوتا ہے یا نہیں، دوسری طرف امریکہ کی خارجہ پالیسی کے بعض رائے کار یہ کہہ رہے ہیں کہ جو جزیرے اس لڑائی میں امریکہ کے ہاتھ آئے ہیں انہیں چھوڑنا نہیں چاہئے بلکہ ساری دنیا میں ہوائی اور بحری اڈے حاصل کرنے چاہئیں، ایشیائی اقوام کے دلوں میں امریکہ کے حریت پسندانہ خیالات اور ان کے علم بردارون مثلاً لنکن کی بڑی وقعت ہے انہی خیالات پر امریکہ کے حیرت انگیز سیاسی ڈھچر کی بنیا دیں رکھی گئی ہیں، لیکن مقام تعجب ہے کہ ان حریت پسندانہ خیالات کے باوجود امریکہ کے باہر کے ملکوں، مثلاً فلسطین میں امریکی پالیسی ایک دوسرے ہی رنگ میں نظر آتی ہے۔ یہ کہنا غالباً کچھ زیادہ نارداانہ ہوگا کہ امریکی حریت پسندی میں امریکی اقتصادی طریقوں کا کچھ نہ کچھ شائبہ ہمیشہ رہا ہے۔ جن ملکوں میں امریکی سرمایہ دارانہ جدوجہد کا زور ہے اور اس کا جو اثر ان کی اقتصادی حالت پر پڑا ہے اسے دیکھ کر بعض اوقات ایشیاء والوں کے دلوں میں امریکیت کے پورے فلسفہ کی طرف سے ایک طرح کا خطرہ اور وسوسہ پیدا ہو جاتا ہے۔

جاپان کے ساتھ امریکہ کے تعلقات کی تاریخ پر غور کیجئے تو اس میں بھی ایک طرح کا تضاد نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ جاپانیوں کو جنگی تیاریوں کے لئے سازو سامان امریکہ ہی سے ملا اس لئے کہ امریکہ کے

بڑے بڑے بیوپاریوں کا فائدہ اسی میں تھا اور پرل ہاربر کے واقعہ تک امریکہ نے جاپان کو ناکارہ لوہے کے ٹکڑے بھیجنا بند نہ کیا تھا۔ امید کی جاتی ہے کہ جنگ کے بعد کی دنیا میں عالمگیر امن اور خوش حالی پیدا کرنے کا جو مصمم ارادہ امریکہ کر چکا ہے۔ اس کا اتنا اثر ضرور ہو گا کہ ایشیا، والوں کو نقصان پہنچا کر اپنا فائدہ کرنے کی خواہش دب جائے گی لیکن ایک سہمی ہوئی دنیا کو مزید اطمینان دلانے کی ضرورت ہے۔ ابھی چند دن کی بات ہے کہ ایک ممتاز ہندوستانی مدبر نے بمبئی میں ایک تقریر کی جس میں انہوں نے اٹلانٹک چارٹر کو ایک بڑے اٹلانٹک لائنر[1] سے تشبیہ دی جس میں پہلے درجہ، دوسرے درجہ تیسرے درجہ اور چوتھے درجہ کے مسافر ہوتے ہیں۔ مقرر کا منشا یہ تھا کہ مشرق کے لوگ جس درجہ میں رکھے جاتے ہیں وہ ان درجوں سے بہت کچھ مختلف ہے جو بڑی بڑی یورپی طاقتوں نے اپنے لئے محفوظ کر رکھے ہیں۔ ابھی حال ہی میں وہ مراسلت منظر عام پر آئی ہے جس میں صدر امریکہ کو ان کے ذاتی نمائندہ مقیم ہندوستان نے ہندوستان کی آزادی کے بارے میں پرزور الفاظ میں متوجہ کیا تھا۔ ہندوستانی قدرتی طور پر یہ دعوے کرتے ہیں کہ ان کے ملک کی آزادی ایک ایسی چیز ہے جس کی تائید آزادی کی خاطر ہونا چاہیئے لیکن یہ دیکھ کر کہ ان کی آزادی پر زور اس وجہ سے نہیں دیا جا رہا کہ وہ آزادی کے مستحق ہیں بلکہ محض اس لئے کہ اس سے امریکہ کو جاپان کے خلاف جنگ کرنے میں مدد ملے گی ان کے دلوں میں خوف اور اندیشہ پیدا ہو گیا ہے۔ ہندوستانی چاہتے ہیں کہ امریکہ والوں

---

[1] بڑی قسم کے امریکی مسافر جہاز جو اٹلانٹک میں چلتے ہیں ۱۲

کی طرف سے ان کے احساسات اور جذبات جس حد تک ممکن ہو گرم دلی اور خلوص پر مبنی ہوں لیکن یہ احساسات صرف اسی صورت میں بڑھ سکتے ہیں۔ جب کہ یہ سمجھ لیا جائے کہ اس ہندوستانی سپاہی کو جو متحدہ اقوام کی خاطر اور جنگ کے بعد اپنے ملک کی آزادی کے لئے اپنا خون بہا رہا ہے گرا یہ کا ٹنڈو کہنا اتنا ہی ناروا اور نازیبا ہے جتنا کہ ان "چار آزادیوں" کو شک وشبہ کی نظروں سے دیکھنا جو امریکہ والوں نے دنیا کو پیش کی ہیں۔

ہندوستان ایک غریب ملک ہے، اسے اپنے معیار زندگی بڑھانے کے لئے ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ یہ لڑائی اسے بہت مہنگی پڑی ہے اور اس کے باشندوں کو امریکہ کے باشندوں کے مقابلے میں بہت زیادہ مصیبتیں اٹھانی پڑی ہیں اگر ان تمام قربانیوں کے باوجود دنیا کی سیاسی اور اقتصادی تنظیم جدید میں ہندوستان کو اس کا واجبی حصہ نہ دیا جائے گا تو اس سے یہ امید کیونکر کی جا سکتی ہے کہ وہ "ایک اچھے ہمسایہ" کا حق جوش اور سرگرمی کے ساتھ ادا کرے؟

امریکہ کے بارے میں ایک عام ہندوستانی کے خیالات اور توقعات کی جو تصویر مذکورہ بالا فقرات میں کھینچی گئی ہے اس کے خد و خال شاید پست اور ادنےٰ درجہ کے نظر آئیں، لیکن یہ تصویر مکمل نہیں ہے، اس لئے کہ ہندوستانی یہ جانتے ہیں کہ امریکہ کی اندرونی سیاسیات اتنی الجھی ہوئی ہیں کہ جو کچھ امریکی اخبارات میں لکھا ہوتا ہے وہ پورے ملک کی رائے یا امریکہ والوں کی تہذیب اور مخیر المزاجی کی پوری طرح ترجمانی نہیں کرتا۔ اس لئے جب کسی ہندوستانی کو اخبار میں کوئی اس

قسم کا بیان نظر آتا ہے جو امریکہ کی ایک مشہور شخصیت نے دیا تھا کہ "امریکہ لڑائی میں اس لئے نہیں شریک ہوا ہے کہ وہ ہر حبشی کو دودھ کا ایک گلاس پلائے" تو اسے کچھ زیادہ تعجب نہیں ہوتا۔ امریکہ کے باشندے دنیا میں سب سے زیادہ فیاض، نیک دل اور مہمان نواز ہیں۔ وہ شان کی نہیں لیتے اور ہر سیلح ایشیائیوں کے ساتھ ان کے اخلاق اور خیر سگالی کو یورپی ممالک کے مقابلہ میں بہت زیادہ بہتر پاتا ہے۔

بعض اوقات یہ کہا جاتا ہے کہ امریکہ کو دراصل ہندوستان کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں ہے اور امریکہ کے لوگ ہندوستانی مسئلہ کی بحث یا تو انگریزوں کو پریشان کرنے یا پھر کسی انتخابی مہم میں کسی خاص مقصد کو حاصل کرنے کے لئے کرتے ہیں ہدستار کو توقع ہے کہ یہ بیان صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ امریکہ ساری دنیا کو، اور خصوصاً ہندوستان کو حریت پسندانہ خیالات، تعلیم، زراعت اور مادی صنعت کاری کے بارے میں بہت کچھ نئی باتیں سکھا سکتا ہے۔ سیاسی حیثیت سے بھی امریکہ کے ساتھ روابط قائم رکھنا ہندوستان کے لئے مفید ہے۔ باشندوں کے ایک بے ربط اور انمل بے جوڑ مجموعے کو لیکر اور اس کے مختلف اجزا کو سمو کر ایک قوم بنا دینا۔ یہ امریکہ کا ایک ایسا کارنامہ ہے جو ہندوستان کے لئے ہمیشہ مشعل راہ بنا رہیگا۔ بلا امتیاز نسل، عقائد یا مذہب ہر امریکی شہری کو اس بات کی آزادی حاصل ہونا کہ وہ اپنے ملک کے صدر بننے کی آرزو کر سکے۔ اس میں بھی ہندوستانیوں کے لئے ایک سبق پوشیدہ ہے۔

لڑائی کے بعد ہندوستان کو امریکی سرمایہ، اور مشینی سامان کی نیز امریکہ کے صنعت کاروں اور صنعتی مشورہ کی ضرورت ہوگی۔ اپنی مشترکہ جنگی مساعی کی بدولت امریکہ اور ہندوستان اب ایک دوسرے کے اتنے قریب آ گئے ہیں کہ یقیناً وہ ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو کچھ نہ کچھ سمجھنے لگے ہوں گے۔ ہندوستان چاہتا ہے کہ امریکہ اس کے خوف اور شکوک اور شبہات کا بھی تھوڑا بہت احساس کرے تاکہ دونوں ملکوں کی آپس کی مفاہمت زیادہ پرخلوص اور پائیدار ہو جائے۔

ساتواں باب

ہندوستان، برطانوی دولت مشترکہ

اور

دنیا

ہندوستان اور انگلستان کا جوگ ہو چکا ہے اور ہمیشہ رہے گا مشیت الٰہی کہئے یا تاریخی حالات کی منطق لیکن واقعہ یہ ہے کہ ایک دوسرے کا ساتھ ان دونوں ملکوں کے لئے مقدر ہو چکا ہے۔ ان دونوں کو اس ساتھ کی ضرورت ہے اور دنیاوی نظام کو ان دونوں کی ضرورت ہے اسی نقطۂ نظر کی روشنی میں اور ایک عالم گیر پس منظر کو آنکھوں کے سامنے رکھ کر میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ ہندوستان اور انگلستان کی شراکت یا اتحاد یا ایک پیش آیند اور پائدار چیز ہے۔

اگر ہم ارتقا کے سارے رجحان اور انسان اور اس کی دنیا کے درمیان روز افزوں وحدت پر غور کریں تو وہ نتیجہ جو اوپر بیان ہوا لازمی اور لابد نظر آتا ہے اگر ایک طرف ریڈیو اور ہوا بازی نے ساری دنیا کے ربط وضبط کو آسان اور فوری بنا دیا ہے تو دوسری طرف نجات اور آزادی کی جنگوں سے گزرتا ہوا ایک عالمی ریاست کا درخشاں نصب العین یعنی انسانی افق پر نظر آرہا ہے یعنی "انسان" اب "عالمی انسان" بن چکا ہے

اور اس کا شاندار مستقبل برابر رو بہ ترقی ہے۔

جہاں تک ہمارا تعلق ہے ترقی کے یہ مدارج صاف طور پر نظر آتے ہیں، ہندو مسلم ہندوستان، برطانوی دولت مشترکہ کی منزل سے ہو کر انسانی دولت مشترکہ کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اگر عام طور پر ساری دنیا کی حالت پر غور کیجئے تو نظر آتا ہے کہ قبیلہ داری وحدتوں سے ترقی کر کے انسان "متحدہ اقوام" کی بلندی تک جا پہونچا ہے تاریخ عالم اب تک اتنی زبردست شیرازہ بندی کی نظیر نہیں پیش کر سکتی، اور آج انسان ایک عہد آفریں تبدیلی کی چوکھٹ پر کھڑا ہے۔

لیکن یہ یاد رکھئے کہ ہر عبوری دَور میں متضاد حالات کی بھرمار ہوا کرتی ہے۔ یورپ میں وہ ملک جو پہلے وحدتوں کی حیثیت رکھتے تھے "خود اختیاری" کے اصول کے آگے سر تسلیم خم کر کے اب چھوٹی چھوٹی با اقتدار ریاستوں میں منقسم ہو گئے ہیں عہد نامہ ورسائی نے اقلیتوں کے مسئلہ کو ایک اہم سیاسی مسئلہ بنا دیا تھا، لیکن قومی خود اختیاری کے اصول نے اسے حل کرنے میں کچھ زیادہ مدد نہ دی۔ خراب سیاسیات اور اس سے بھی بدتر اقتصادیات نے نئی پرانی سب ریاستوں کو پھر سے خلفشار کی حالت میں ڈال دیا ہے، اور معاہدہ ورسائی نے جس یورپ کو جنم دیا وہ مخالفت کی اس بس بھری فضا کو صاف کرنے سے قاصر رہا ہے۔ اکثر ارباب فکر پہلے ہی سے سمجھے بیٹھے تھے کہ موجودہ جنگ ضرور ہو کر رہے گی:

> اُس وقت کی طرح اب بھی یورپ جس منزل پر پہونچ گیا ہے وہاں صاف صاف نظر آ رہا ہے۔ اور شاید اس سے پہلے یورپ کی تاریخ میں کبھی یہ چیز اتنی صاف نظر نہیں آئی۔ کہ اب اس کے

سامنے صرف دو انجام ہیں جو ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں، یعنی یا تو وہ بے تکان ایک نئی جنگ کی منزل کی طرف بڑھے یا پھر اپنے بے جا غصہ، تعصب اور مجنونانہ جوش و خروش پر قابو پا کر امن کی پائیدار تنظیم کی کوشش کرے۔ انسانی روح کے پاس ان دونوں صورتوں کے لئے مادی قوت موجود ہے۔ سائنس اپنی روز افزوں معجز نمائیوں کے ساتھ ہمارے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی ہے، اب ہم چاہیں اس سے بنانے کا کام لیں یا بگاڑنے کا۔ سائنس کی مدد سے ہم اگر چاہیں تو تہذیب کی اینٹ سے اینٹ بجا سکتے ہیں یا پھر دوسری طرف فراوانی اور خوشحالی کا ایک ایسا دور شروع کر سکتے ہیں جس کی نظیر انسان نے مشکل ہی سے دیکھی ہوگی۔ بہر حال جنگ نے ہمارے لیے ایک بہت بڑا ترکہ چھوڑا ہے۔ اور سر دست یورپ کا اخلاقی اتحاد پارہ پارہ ہو چکا ہے"[1]۔

یہ صورت حالات افسوس ناک ہے اور نازک بھی لیکن یہی تو تہذیب یورپ کا معما ہے۔ انسان اپنے باہر قدرت پر جتنا قابو پاتا جا رہا ہے اتنی ہی اپنے اندر خود اپنی فطرت پر اس کی گرفت ڈھیلی ہوتی جا رہی ہے۔ وہ سمندر کی تہ کو کھنگالتا اور ستاروں کی دنیا پر ہاتھ مارتا ہے لیکن انسانوں کے دلوں تک رسائی اس کی دسترس سے باہر ہوتی جاتی ہے۔ اس کی ساری حدِ نظر پر ایک افسوس ناک حد تک مادیت چھائی ہے۔ وہ سطحی چیزوں کے پیچھے بے تکان بھاگتا اور اپنی عقل کے پرتو سے انھیں بھڑک دار بناتا چلا جا رہا ہے۔ وہ محبت کو ایک مبہم نصب العین کہہ کر اس کا مذاق اڑاتا ہے اور مذہب کو دین بنا پر

[1] اقتباس از "تاریخ یورپ" مصنفہ ایچ۔ اے۔ ایل فشر، جلد سوم، صفحہ ۱۲۲۲ (۱۹۳۵ء) ۱۲

رد کر دیتا ہے کہ اس پر سائنس کی مہر تصدیق ثبت نہیں ہے۔ غرض کہ اسی طرح ایک المناک جوش و خروش کے ساتھ وہ سیاسیات اور اقتصادیات کی بستیوں کے گھروندے تیار کرتا ہے جو بنتے ہی بگڑ جاتے ہیں۔ اس کی نظر میں ہر غیر مادی چیز غیر اہم ہے' اس لئے جب کبھی وہ کوئی معاہدہ اتحاد کرتا ہے تو پہلے مفادات پیدا کر دیتا ہے کیونکہ اِس چیز کے بارے میں جسے وہ لاابالی پن سے انسانی کمزوری کہتا ہے اس کا مبلغ علم بس اسی قدر ہے۔ مفادات کی حصہ داری پائدار نہیں ہوتی، البتہ نصب العین کی حصہ داری دیرپا ہوتی ہے لیکن سیاسیات میں نصب العین کی پروا کون کرتا ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر صلح جنگوں کے درمیان کا ایک وقفہ بن جاتی ہے۔

ایسے اصحاب فکر موجود ہیں جنھیں اس میں بہت کچھ شک ہے کہ گزشتہ جنگ عظیم جمہوریت کو بچانے کے لئے لڑی گئی تھی۔ برخلاف اس کے ہم دیکھتے ہیں صلح کے بہت تھوڑے عرصہ کے اندر ہی اندر نازیت' فسطائیت اور اشتراکیت سب کے سب نے پرانی جمہوریت کے خلاف عملی احتجاج کا جامہ پہن کر اس پر دھاوا بول دیا تھا' خود بین الاقوامیت بھی الجھنوں سے خالی نہ تھی۔ کئی چھوٹی چھوٹی نئی قومی ریاستوں کے قیام نے انتشار کو اور بڑھا دیا تھا۔ یہ ریاستیں قومی خود اختیاری کے اس کتابی اصول پر قائم کی گئی تھیں کہ ہر قوم کو ایک ریاست بنانے کا حق پہونچتا ہے اور ان کے قیام میں فوجی اور اقتصادی حفاظت کا ذرا بھی لحاظ نہ رکھا گیا تھا تعجب کا مقام ہے کہ ہندوستان میں کچھ لوگ ایسے بھی موجود ہیں جو یورپ کے حشر کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور پھر بھی اسی کے نقش قدم پر چلنا چاہتے ہیں اور تنا نہیں سوچتے کہ یہی حشر آسانی سے ہندوستان کا بھی ہو سکتا ہے۔ غیر محدود، یا کم از کم غیر مربوط اور غیر منظم قومی اقتدار کا اصول اب ہمیشہ کے

لئے مٹ چکا ہے۔ اور تاوقتیکہ ممکنہ اور وسیع ترین پیمانے پر بین الاقوامی تعاون نہ ہوئے جنگ کے بعد کی نئی دنیا کا مستقبل پرانی دنیا سے بھی زیادہ تاریک بن جائے گا مطلق خود اختیاری میں انتشار کی قوتیں مضمر ہوتی ہیں، سنہ ۱۹۳۹ء کی جنگ دراصل انہی کا نتیجہ تھی۔ پچھلی غلطیاں ہمیں کتنی بھی مہنگی پڑی ہوں، لیکن اگر ان خوفناک تجربوں کے بعد اب بھی ایک سچا بین الاقوامی نظام پیدا ہو جائے تو ان سب کی تلافی ہو جائے گی ۔،

امن کی منصوبہ بندی کی قیادت اتحادیوں ہی کے ہاتھ میں ہے، لیکن اگر ان کی نظریں صرف یورپ اور امریکہ ہی پر جمی رہیں تو بہت ممکن ہے کہ وہ یہ لڑائی جیتنے کے بعد بھی صلح ہار جائیں۔ اگر وہ گورے رنگ والی دنیا سے بالاتر نہ ہوئے تو جو نظام وہ بنائیں گے وہ عالمی نظام کے بجائے کوئی دوسری ہی چیز ہوگا۔ یورپی تہذیب کی قوتوں کے نمائندوں کو سمجھ لینا چاہیئے کہ اگر انھوں نے یورپی نظام کو بقیہ دنیا کے سر منڈھا تو وہ کسی طرح بھی عالمی نظام نہ کہا جا سکے گا، اور جب تک کہ ایک حقیقی عالمی نظام قائم نہ ہو یورپ کو جنگ سے چھٹکارا نصیب نہ ہوگا۔ یورپ اور امریکہ کو یہ حق بے شک پہونچتا ہے کہ وہ اپنی انفرادی وحدت کو قائم رکھیں، لیکن یہ چیز الگ تھلگ رہ کر نہیں بلکہ انسانی آزادی کے اصول کو تسلیم کرتے ہوئے ہونی چاہیئے اور آزادی کا تقاضا ہے مساوات۔ کیا یورپی نظام کی قوت محرکہ یہ ہونی چاہیئے کہ اس کے ذریعہ غیر یورپی ممالک سے ناجائز طریقہ پر فائدہ اٹھایا جا سکے گا؟ بین الاقوامی سیاسیات کے ایک مشہور رسالے کا ر کا افسوس ملاحظہ ہو:۔

"یورپی ممالک نے بڑی حماقت کی کہ ایک دوسرے سے لڑ پڑے وہ اگر چاہتے تو ایشیا اور افریقہ میں برابر پھیلتے رہتے اور

اس سے ان کی بڑھتی ہوئی خوش حالی قائم اور ان کی سماجی ترکیب برقرار رہتی"[۵۱]

اگر یورپی نظام کی بنیادیں اسی منطق پر رکھی جانے والی ہیں تو شاید جب تک ایسا نظام قائم رہے گا یورپ حماقتوں کا مجسمہ بنا رہے گا۔ جب تک کوئی غالب طاقت موجود ہے امن نہیں ہو سکتا، اس لئے غلبہ کی نفسیات ہی امن کے خلاف ہے۔ ایک سچی اور ترکیبی عالمی جماعت صرف اس صورت میں وجود میں آسکتی ہے جب کہ ترقی یافتہ اور پست تمام باشندگان عالم کے مشترکہ مسئلہ کو صاف طور پر سمجھ لیا جائے۔

پہلی اگست ۱۷۸۹ء کو جو اعلان کیا گیا تھا[۵۲] وہ صرف فرانسیسی حقوق کے بارے میں نہیں بلکہ حقوق انسانی کے متعلق تھا۔ اس کے بعد دوسرا اہم فرانسیسی انقلاب نیز جرمن انقلاب ۱۸۴۸ء میں ہوا، اور درمیانی مدت میں نپولین کی لڑائیاں ہوتی رہیں۔ ان انقلابوں میں کچھ نئی قوموں نے جنم لیا۔ طرح طرح کی اور شدید قومی جنگیں شروع ہو گئیں۔ جن میں سے سب سے زیادہ مشہور لڑائیاں ہیں جو ۱۸۵۹ء، ۱۸۶۶ء اور ۱۸۷۰ء میں ہوئیں، یہاں تک کہ یہ سلسلہ ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم تک پہونچ گیا۔ اگر ایک طرف قومی جذبات اور قومی امنگوں نے انسان کی عظمت دو بالا کر دی تو دوسری طرف ان کی وجہ سے جنگ کے شعلے بھی برابر بھڑکتے رہے۔ امن اور آزادی کے بارے میں انسان کی کوششیں بے شک بڑھیں، لیکن ساتھ ہی نفرت اور جنگیں بھی زیادہ ہوتی گئیں۔ ایجادات کی ترقی، وسائل نقل و حمل کی نشو و نما اور باہمی روابط کی وسعت کے ساتھ ساتھ ہر نئی جنگ سے قوموں کی زیادہ تعداد متاثر ہونے

---

[۵۱] مصنفہ ای، ایچ. کار صفحہ ۱۳ [۵۲] یہ اعلان انقلاب فرانس کے ذور میں ہوا تھا

لگی۔ اور جیسے جیسے قومیں لڑائی کے کشت و خون میں سے گزرتی گئیں ویسے ویسے ان کی قومیت پسندی بھی بڑھتی گئی۔ مختلف قومی ریاستوں کے شہریوں کے درمیان وہ دیواریں کھڑی ہوگئیں جنھیں "دفاعات" کہا جاتا ہے۔ یعنی فوجیں، بڑے بڑے ہوائی فوج اور ناقابل تسخیر سرحدی مورچے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اور اندر ہی اندر بین الاقوامیت کا ڈھانچہ بھی تیار ہوتا گیا، کیونکہ آہستہ آہستہ ساری دنیا کے عام آدمیوں کے ذہن بنی نوع انسان کے ساتھ مشترکہ وفاداری کے سلسلہ میں منسلک ہوتے گئے۔ امید ہے کہ اب ہم آئندہ قومیت کی ہیبت ناک لڑائیاں نہ دیکھیں گے۔

یہ سوال کہ کیا آج کل کی لڑائیاں، عام طور پر مخالف فلسفوں کے تصفیے کے لئے ہوتی ہیں ایک بحث طلب مسئلہ ہے۔ اگر ایسا ہے تو انھیں عہد متوسط کی مذہبی جنگوں کا ایک نیا چولا سمجھنا چاہیئے۔ اگر ہم نصب العینوں کے اختلاف کو دور کرنے کے لئے خوں ریزی کے علاوہ اور کوئی طریقہ نہیں نکال سکتے تو ترقی کے متعلق ہمارے بلند بانگ دعوؤں کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے۔ ان حالات سے تو معلوم ہوتا ہے کہ شاید ہم اب تک زور و طاقت کی سیاسیات[1] کی بھول بھلیاں میں بھٹک رہے ہیں۔ محوری طاقتوں نے جب اپنا دور شروع کیا تو ان میں اور دوسروں میں تصوراتی اختلافات بہت کم تھے، لیکن وہ بہت جلد سائنٹفک صنعتی تہذیب کے زہریلے اثر سے مغلوب ہوگئیں۔ مسیحیت یا مخالف مسیحیت اس تہذیب کا جز نہیں ہیں۔ اس کے عناصر تو مشین، تیل، ربڑ، پٹرول، زمین اور ایسی ہی دوسری چیزیں ہیں۔ طاقت کی ہوس۔ جس میں دوسروں کا خیال نہیں ہوتا اور جو

---

[1] POWER POLITICS

اسی وجہ سے دست درازانہ ہوتی ہے۔ یہی دراصل لڑائی کی جڑ ہے۔

جنگ تمامتر تباہی اور بربادی کا نام نہیں ہے۔ اکثر اوقات بعض اخلاقی فرائض ایسے ہوتے ہیں جو صرف جنگ ہی سے پورے ہو سکتے ہیں چنانچہ موجودہ جنگ بھی، باوجود اس کے کہ اس کا دامن زور اور طاقت کی سیاست سے داغدار ہے، ایک اہم اخلاقی پہلو رکھتی ہے۔ آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ محوریوں کی پیس بھری تنظیم جو تباہی اور بربادی کا کام کرنے کے لئے طلب کی گئی ہے حقوق انسانی کو پامال کر رہی ہے۔ جو لوگ ان حقوق کو عزیز رکھتے ہیں ان کا فرض یہ ہے کہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر تعمیر کی منزل کی طرف بڑھتے رہیں اور خون سے نہائی ہوئی زمین میں ایک پاک تر دنیا کا بیج بوئیں۔ ہٹلر اور اس کے نسل پرستی کے عقیدے کی شکست کے بعد پہلے سے زیادہ انسانی اتحاد پیدا ہو سکے گا۔

جنگ کے اس پورے دھندے میں ہاری ہوئی قوموں کی طرح مغرب کی فتح مند قوموں کو بھی اپنے گناہوں کا کفارہ دینا ہوگا، اور اس آنچ میں تپنے کے بعد ان میں پہلے سے زیادہ شرافت کے جوہر پیدا ہو جائیں گے اور وہ پہلے سے بہتر طریقہ پر انسانی خاندان کے گھر بار کو نئے سرے سے ترتیب دے سکیں گی۔

اسلحہ، کارکردگی اور سفارتی مصلحتوں کے جو بت آج کل کی دنیا نے بنا رکھے ہیں وہ اپنے پرستاروں سے زبردست بھینٹ مانگ رہے ہیں۔ گوری قومیں ایک دوسرے کے ساتھ زندگی اور موت کی کشمکش میں گتھی ہوئی ہیں اور کالی اور بھورے رنگ کی قومیں ان کی مدد کے لئے بلا لی گئی ہیں۔ کارکردگی اور ہنرمندی کے مختلف مجموعے مغرب کی وحدت کو پراگندہ کرنے میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر کام کر رہے ہیں۔ یورپ نے زور اور طاقت سے کام لینے کے جو خطرناک ضابطے بنائے تھے اب وہ خود ان کی زد میں آگیا

ہے۔غریب مشرق جو سدا بدنام اور مطعون رہا ہے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس اس نظارے کو دیکھ رہا ہے اور دبی زبان میں پوچھتا ہے کہ جو کچھ سامنے نظر آرہا ہے کیا یہی عظمت و شرافت کی تصویر ہے۔لیکن شاید اسی جنگ کی بدولت اب وہ زمانہ آگیا ہے کہ مشرق اور مغرب اپنی اپنی روایات کا ایک دوسرے سے مقابلہ کریں اور اپنے اپنے اقدار اور معیار کا باہمی تبادلہ کریں۔امریکہ اور برطانیہ کے ساتھ چین اور ہندوستان کی سنگت ایک نیک شگون ہے۔

لڑائی کا سبب کچھ بھی ہو، لیکن وہ اس سچائی کے ثبوت کی ایک مثال پیش کرتی ہے کہ اکثر اوقات شر ہی سے خیر پیدا ہوتا ہے۔یورپ کا فرض ہے کہ وہ اپنی سائنس کی حدود کو تسلیم کرلے اور "نسل" کے بارے میں اپنے تصور کو بدل ڈالے۔آج نسلی ملاحظات بے روک ٹوک سیاسیات میں داخل کئے جارہے ہیں۔انگریزی لفظ ریس (نسل) لاطینی زبان کا لفظ ہے۔اور اس کا تصور پرانا اور عام ہے، لیکن نام نہاد "نارڈک آریاؤں"[1] نے نسل کا ایک نیا مسلک گھڑ لیا ہے جس کا انتہائی نقطہ ہٹلر کا نظریہ ہے کہ کچھ نسلیں آقا ہوتی ہیں۔اور کچھ ان کی معاون۔جاپان نے بھی اس بارے میں اپنا الگ الگ نظریہ بنا لیا ہے۔کسی نہ کسی صورت میں نسل کا مسئلہ سب ملکوں کی گردن پر سوار ہے۔اس نے نازک صورت اس وقت اختیار کی جب مغربی باشندوں نے ملک گیری اور آبادکاری شروع کی چند دنوں کی بات ہے کہ

NORDIC ARYANS [1]

جرمن اپنی نسل یہی بتاتے ہیں ۱۲

امریکہ کو بھی ایک کمیٹی پیسفک کی نسلوں کے تعلقات کی کمیٹی[۵۱] کے نام سے بنانی پڑی تھی۔ جہاں کہیں سفید فام قوموں کے رنگین قوموں پر غلبے کا سوال رہا ہے وہاں اس نسلی مسئلہ کی بدولت مغلوب قوموں سے ناجائز فائدہ اٹھایا گیا ہے اور مغرب کی جیبیں بھرنے کے لئے مشرقی غلام[۵۲] پیدا کئے گئے ہیں لیکن جہاں کہیں یہ مسئلہ صرف سفید فام قوموں تک محدود رہا ہے۔ وہاں اس کی بدولت طرح طرح کی اور چھوٹی بڑی جنگیں لڑی گئی ہیں۔ جب لڑائی ختم ہو جائے گی تب یہ محسوس ہوگا کہ برادری اور بھائی چارہ کے تصورات کو سفید رنگت والی کوٹھڑی میں بند کر کے رکھنا ان کے لئے غیر صحت بخش ہے اور ان میں انسانیت کی کھلی ہوا میں سانس لینے کی ضرورت ہے۔ اگر یہ ہوا تو اس جنگ کا مقصد پورا ہو جائے گا۔ اور وہ بے نتیجہ ثابت نہ ہو گی۔

سمندر پار کے ہندوستانیوں کا مسئلہ بھی اسی نسلی جھگڑے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے لیکن یہ مسئلہ صرف ہندوستان تک محدود نہیں ہے بلکہ دراصل سلطنت برطانیہ کا مسئلہ ہے۔ خارجی معاملات میں ہندوستان کو برطانیہ سے جو شکایتیں ہیں وہ زیادہ تر اس سلوک کی وجہ سے ہیں جو دولت مشترکہ کے ممالک اور سلطنت برطانیہ کی نوآبادیوں میں ہندوستانیوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اگرچہ اس سلوک کی کی ذمہ داری برطانیہ عظمیٰ پر عاید نہیں ہوتی لیکن یہ واقعہ ہے کہ برطانیہ نے اس کی اصلاح میں اپنی پوری طاقت صرف نہیں کی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نوآبادیوں اور ڈومی نینزوں کے باشندے اپنے دماغوں سے نسلی امتیازات

---

۵۱ PACIFIC RACE RELATIONS COMMITTEE

۵۲ WILKIE, ONE WORLD

کو دور کرنے کے قابل نہیں رہے ہیں یہ واقعہ ہے کہ ہندوستان اب تک اپنے غیر ممالک میں بسنے والے باشندوں کے حقوق کی حفاظت کا اطمینان بخش انتظام نہیں کر سکا ہے، اور برطانوی دولت مشترکہ کے مختلف ملکوں میں ہندوستانیوں کو جو حیثیت دی جاتی ہے اسے دیکھتے ہوئے کوئی ہندوستانی دولت مشترکہ کے نصب العینوں کا پُرجوش حامی نہیں بن سکتا۔

جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں پر سیاسی زندگی میونسپل معاملات، وطن گزینی، املاک، تجارت، تعلیم۔ان سب باتوں کے متعلق پابندیاں لگا دی گئیں ہیں۔سیلون میں انھیں سیلون والوں کے مساوی شہری حقوق حاصل نہیں ہیں۔کناڈا کے صوبہ برٹش کولمبیا میں ہندوستانی میونسپل صوبہ واری اور فیڈرل انتخابات میں حق رائے دہی سے محروم ہیں۔برٹش گائینا، ٹری نی داد اور جمائیکا میں ہندوستانیوں کو اپنے مُردے جلانے کی اجازت نہیں ہے۔یہ بڑی سنگین بات ہے، اس لئے کہ اپنے مردوں کو جلانا ہندوؤں کا مذہبی فریضہ ہے۔کنیا، ٹانگانی کا اور یوگنڈا میں ہندوستانیوں سے سرکاری ملازمت اختیار کرنے کے بارے میں ناروا امتیازی سلوک کیا جاتا ہے۔فی جی میں ہندوستانیوں کو زمین خریدنے کی اجازت نہیں ہے آسٹریلیا میں اگر کوئی ہندوستانی مستقل سکونت اختیار کرنا چاہے تو اس ملک میں داخلہ کی بھی اجازت نہیں دی جاتی۔

یہ تمام پابندیاں اور نسلی امتیازات نہ صرف ذلت آمیز اور غصہ دلانے والے ہیں بلکہ ان کو دیکھ کر یہ بنیادی سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر برطانوی دولت مشترکہ کا مقصد کیا ہے؟ ہندوستانیوں کو جو حیثیت دی جاتی ہے وہ اس بات کی کسوٹی ہے کہ دولت مشترکہ ایک حقیقت ہے یا صرف ایک خوش آئند

کلمہ اگر ہمارے ملک والوں کو وائی کاؤنٹ پیل[1] کے ان الفاظ میں جو اُنھوں نے ۱۹۲۳ء کی امپیریل کانفرنس میں کہے تھے "ڈومی نینوں کی غیر ملکی ہیئت سیاسیہ" سمجھا جائے تو اب یہ غور کرنے کا وقت آگیا ہے کہ ہندوستان دولت مشترکہ سے الگ کیوں نہ ہو جائے میں اس اہم مسئلہ کو جذبات وتھت، عزت اور ساتھ ہی اصول کا مسئلہ قرار دیتا ہوں۔ اور یہ ہے بھی ایسا ہی کیونکہ ملک معظم کی چھ رعایا میں سے پانچ ہندوستانی ہیں۔ سیاسیات اور اقتصادیات کا سوال بعد میں آتا ہے۔ ہندوستان کا یہ منشا ہرگز نہیں ہے کہ اس کی رعایا پر وہ واجبی پابندیاں بھی نہ عاید کی جائیں جو مختلف ڈومی نین اور نوآبادیاں اپنے طویل المدت مفادات کی حفاظت کے لئے عاید کرتی ہیں، لیکن وہ یہ ضرور چاہتا ہے کہ اس کی رعایا کے نقطۂ نظر کو واضح طور پر سمجھ لیا جائے۔ ان ملکوں میں اپنے خاص نمائندے بھیجکر ہندوستان نے ظاہر کر دیا ہے کہ اگر ہندوستانیوں کی وطن گزینی سے کچھ مشکلات پیدا ہونے کا اندیشہ ہو تو وہ اُنھیں پورے تعاون کے ساتھ حل کرنے کے لئے آمادہ ہے، لیکن ان باتوں میں ہندوستان کے صبر کی بھی آخر ایک حد ہے۔ وہ دوسری طرف سے حسن سلوک کے اشارات کا انتظار کرتے کرتے اب تھک گیا ہے۔

ان سب باتوں کے باوجود کئی ایسی اہم اور ٹھوس باتیں ہیں جو ہندوستان کو دولت مشترکہ کے دائرہ کے اندر رہنے کی ترغیب دیتی ہیں۔ دماغ اور کلچرل (ثقافتی تعلقات) یہ اس سلسلہ کی مضبوط ترین کڑیاں ہیں۔ لیکن یہ سنجوگ اسی وقت پورا ہو سکتا ہے جب کہ ہندوستان کو دولت مشترکہ کے اندر اس

---

[1] VISCOUNT PEEL

سے زیادہ اطمینان بخش دائرہ عمل دیا جائے جتنا کہ اُسے اب حاصل ہے۔ مثلاً مشترکہ دفاعی اور خارجہ پالیسی کی تشکیل میں ہندوستان کی آواز بھی سنی جائے جب تک یہ نہ ہوگا اسے دولت مشترکہ کے ساتھ وہ دلچسپی نہ ہو سکے گی جو اپنایت کے تصور سے ہوا کرتی ہے۔ برطانوی جنگی کابینہ میں ہندوستان کو مستقل نمائندگی ملنی چاہیئے علیٰ ہذا ڈومی نین وزرائے اعظم کی کانفرنس میں اس کی رائے کو دوسروں کے برابر وزن ملنا چاہیئے۔ برطانیہ کی سفارتی قنصلی، نوآبادیاتی اور سول سروس میں ہندوستانیوں کا بھی تقرر کیا جائے سرکار ہند انڈین سول سروس میں انگریزوں کو رکھتی ہے، اسی طرح ملک معظم کی حکومت کو بھی چاہیئے کہ اس کے زیر انصرام جو سروسیں ہیں ان میں ہندوستانیوں کو رکھے۔ اگر اس طرح کے انتظامی رشتے قائم ہوگئے تو ہندوستان سلطنت متحدہ اور بقیہ دولت مشترکہ کے مابین دوستانہ تعلقات مضبوط رہیں گے۔ یہ آئندہ کا سوال ہے مگر فوری طور پر بھی ان تعلقات کو مضبوط بنانے کے لئے کلچرل (ثقافتی) روابط قائم کئے جا سکتے ہیں۔

اگر برطانیہ کے ساتھ ہندوستان کا تعلق باقی رہنا ہے تو اس کے لئے گہرے کلچرل تعلقات کا انتظام ازبس ضروری ہے ہمارا یہ مقالہ جو برطانیہ اور ہندوستان کے درمیان ایک ممکنہ عہد نامے سے بحث کرتا ہے نامکمل رہ جائے گا اگر اس میں تعلقات کو بہتر بنانے کی کچھ تجویزیں نہ پیش کی جائیں جب تک دونوں ملکوں میں دل نہ ملیں تب تک کوئی عہد نامہ پائدار نہیں ہو سکتا۔ جب ہندوستان کو ڈومی نین کا درجہ یا آزادی مل جائے گی تو برطانیہ کے ساتھ اس کا رشتہ

ان چیزوں پر منحصر ہوگا:۔

(الف) جذبہ اور آپس کا خیال اور لحاظ۔

(ب) دونوں طرف سے اس حقیقت کا اعتراف کہ ایک دوسرے سے ربط ضبط قائم رکھنے میں دونوں کی بھلائی ہے۔

ہندوستان میں اب ہر طرف سے یہ مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ طاقت ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں منتقل کر دی جائے لیکن اس منتقلی کے طریقہ کے بارے میں اب تک کوئی اتفاق رائے نہیں ہے۔ غیر ممالک کی طرف سے جو تازہ ترین اعتراضات کئے جا رہے ہیں۔ ان کا ایک پہلو یہ ہے کہ برطانیہ نے ہندوستانی آبادی کی سماجی، تعلیمی اور اقتصادی ترقی کے لئے یا تو کچھ نہیں کیا اور اگر کیا ہے تو برائے نام۔ ملک معظم کی حکومت کی پالیسی اب یہ معلوم ہوتی ہے کہ ہندوستان کی ہر طرح سے مدد کر کے اسے جلد سے جلد برطانوی دولت مشترکہ کی اقوام کا ایک مطمئن اور خوش حال رکن بنا دیا جائے۔ اور یہ ایک ایسا مقصد ہے جس سے بلا امتیاز ذات یا عقائد کسی سمجھدار ہندوستانی کو خلاف نہیں ہو سکتا، بدقسمتی سے بحث اور مناظرہ کی گرماگرمی میں وہ باہمی اعتماد جو ہندوستان اور برطانیہ عظمیٰ کو ایک دوسرے پر ہے، نظروں سے اوجھل ہو گیا ہے، اور برطانوی باشندوں کی خیر سگالی کا رُخ اس ملک کے باشندوں کی طرف پھیرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جنگ کے بعد اپنے ملک کے ساتھ برطانوی رویہ کے بارے میں ہندوستانی بدظن ہوتے جا رہے ہیں۔

ہندوستان میں خواندہ لوگوں کا فیصدی تناسب بلاشبہ بہت کم ہے لیکن دوسری طرف ریڈیو سننے والوں کی روز افزوں تعداد سے اس کی تلافی ہوتی جا رہی ہے۔ سینما بھی ملک پر اپنا تعلیمی اثر ڈال رہے ہیں۔ ہندوستانی

سپاہی تقریباً جنگ کے ہر منطقہ میں لڑتے رہے ہیں اور سمندر پار کی آزاد قوموں کے سپاہیوں کے دوش بدوش آزمائش اور فتح دونوں میں انکے ساتھ رہے ہیں۔ اب ان میں بھی متحدہ اقوام کے دوسرے رفیقوں کی طرح یہ یقین پیدا ہوگیا ہے کہ جس مقصد کے لیئے سب ملکر لڑ رہے ہیں وہ حق اور انصاف پر مبنی ہے۔ ہر بڑے شہر میں سیاسی اقتصادی، سماجی اور کلچرل موضوعوں پر تقریروں کا رواج بڑھتا جا رہا ہے۔ ان سب باتوں کی وجہ سے ہندوستانی رائے عامہ سے پہلے سے زیادہ باخبر ہوتی جارہی ہے اور زندگی کی اعلیٰ تر نعمتوں کی خواہش روز بروز تیز ہورہی ہے۔ غرضکہ اب ہندوستانی اثر قبول کرنے کے لیے تیار ہیں اور اگر برطانیہ کی طرف سے جسے وہ مغربی تہذیب اور کلچر کا سرچشمہ سمجھتے ہیں کوئی ہمدردانہ اور ہمت افزا لفظ اس کے کانوں میں پڑے تو وہ اسے ضرور شوق اور سمجھداری کے ساتھ سنیں گے۔

ہندوستان کے عوام بہت غریب ہیں، ان کا معیار زندگی بہت پست ہے۔ کافی خوراک نہ ملنے سے جو برے نتائج پیدا ہوسکتے ہیں وہ ان سب میں مبتلا ہیں۔ ایک ایسی سوسائٹی میں جہاں دولت کی تقسیم اتنی غیر مساوی ہو، پست اور بلند کا تفاوت آسانی سے جذبات کو برانگیختہ کردیتا ہے، اسی لئے اس صورت حالات کی اصلاح کی خواہش روز بروز زور پکڑ رہی ہے۔ چونکہ سرکار ہند عوام میں براہ راست پبلسٹی (اشاعت معلومات) بہت کم کرتی ہے اس لئے سیاسی پروپیگنڈا بازوں کے لئے میدان صاف ہوگیا ہے۔ پس یہ احساس کہ ہندوستان کی یہ ساری مصیبتیں بدیسی حکومت کی لائی ہوئی ہیں روز بروز قوی ہوتا جا رہا ہے، اور ہندوستانی سیاست کاروں کا ایک طبقہ نیز ہندوستانی پریس کا ایک حصہ واقعات کو تلخ سے تلخ

الفاظ میں اور بڑھا چڑھا کر بیان کر کے اس احساس کو اور مشتعل
کر رہا ہے۔ موجودہ صورت حالات کی روک تھام نہ کرنا گویا اپنے
سر تباہی لانا ہے۔ ممکن ہے کہ خانہ جنگی شروع ہو جائے لیکن ہندوستان
جیسے بڑے ملک میں اس سے بھی ہماری مشکل آسان نہ ہوگی۔ لہذا
بہ از حد ضروری ہے کہ ہندوستان کی بہبودی کے ضامن ہونے کی
حیثیت سے برطانیہ عظمیٰ کے باشندے اس ملک کی عام ترقی میں
حصہ لیں۔ جس طرح بھی ہو برطانیہ کی آواز کو ہندوستان تک پہنچانا
ضروری ہے +

ان دوسرے فائدوں کے علاوہ جو ہندی برطانوی تعلقات
کی وجہ سے برطانیہ کو حاصل ہوئے ہیں یہ ملک برطانیہ کی طرفداری
میں دو زبردست لڑائیاں لڑ چکا ہے۔ یہ دونوں لڑائیاں صرف
برطانیہ کی زندگی اور موت کا سوال ہی نہ تھیں بلکہ ان نصب العینوں
کی بقا اور فنا بھی جن پر جدید تہذیب کا دارومدار ہے ان پر منحصر
تھی۔ اخلاقی پہلو جتنے اس جنگ میں نمایاں اور واضح ہیں، اتنے
کبھی پہلے نہ تھے۔ پچھلی لڑائی کے بعد ہندوستان کو فتح کا پھل
سیاسی اصلاحات کی صورت میں ملا اور ان ہی کی وجہ سے
وہ اپنی اقتصادی اور سماجی حالت کو سدھار سکا۔ ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء
کی لڑائی میں ہندوستانی فوجیں جرمن فوجوں اور لندن کے
درمیان سینہ سپر ہو گئی تھیں۔ اور جرمنی اور ترکی کی مشترکہ
چڑھائی کا مقابلہ کر کے مشرق وسطیٰ کو بچا لیا تھا۔ موجودہ
لڑائی میں اس وقت جب کہ برطانیہ اکیلا میدان

میں کھڑا تھا ہندوستان کی فوجیں ڈنکرک سے لیکر ہانگ کانگ تک جہاں کہیں بھی سلطنت کے مقامات میں کھاپنچے نظر آتے تھے اُن میں بھر رہی تھیں۔

ہندوستان میں بھرتی کا سب سے زیادہ زور اگست ۱۹۴۲ء میں یعنی اس زمانہ میں ہوا جبکہ کانگریس نے اپنی سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دی تھی۔ آج آپ کو ہندوستان کے دور دراز دیہاتوں میں میدان جنگ سے ہندوستانیوں کی لائی ہوئی دل ہلا دینے والی سوغاتیں ہاتھ پاؤں سے معذور سپاہیوں کی صورت میں ملتی ہیں ہندوستان کی بیواؤں اور ماؤں کے لیئے جن کے شوہر اور بیٹے لڑائی میں کام آئے ہیں اپنی انگلستان کی اُن بہنوں کی طرف سے جنھوں نے اس مقصد کے لئے قربانیاں دی ہیں شکریہ اور قدردانی کا ایک ایک لفظ خوشی کا موجب ہوگا ہندوستانی سیاست کار برطانیہ کی مخالفت میں جو دھواں دھار تقریریں کرتے ہیں ان کی وجہ سے اکثر اوقات ہندوستان کا یہ تعاونی اور دوستانہ پہلو نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ ہمارے سیاست کار بھی تو آخر برطانوی حکومت ہی کی پیداوار ہیں۔ برطانیہ نے ہندوستانی باشندوں میں یہ یقین اور اعتماد پیدا کر دیا ہے کہ اس مرتبہ ہندوستان کی خود اختیاری صلح کا ایک قدرتی حصہ ہوگی بعض اوقات یہ کہا جاتا ہے کہ ہندوستانی سپاہی کرایہ کا ٹٹو ہے اور کچھ برطانوی اشخاص بھی اسے سچ سمجھنے لگے ہیں حقیقت یہ ہے کہ ہندوستانی سپاہیوں کی بہت بڑی تعداد زراعت پیشہ ہے اور کسی صنعتی کارخانے یا شہر میں کام کرنے والے ایک اوسط مزدور کے برخلاف انکا وجود اس ملک کے وجود کے ساتھ وابستہ ہے جنگ میں ہندوستان نے جو کچھ مدد دی ہے اس کا اندازہ صرف اس کی فوج بیڑے اور ہوائی فوج کے کارناموں ہی سے نہیں ہوتا ہے بلکہ کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی تعداد، وائسرائے فنڈ میں رضاکارانہ طور پر دیئے گئے

چندوں، والیان ریاست اور ہندوستانی ریاستوں کی فوجوں کے کارناموں اور ہندوستانی صنعت کاروں کے اس پرجوش تعاون سے بھی ہوتا ہے جس کی بدولت زمانہ جنگ میں کارخانے پورے زور کے ساتھ چلتے رہے۔ یہ ہندوستانی آبادی کی غالب تعداد کی کہانی ہے جن کا عقیدہ یہ ہے کہ برطانیہ اور ہندوستان کا سنجوگ مقدر ہو چکا ہے۔ یہ کہانی ایسی ہے جسے برطانیہ عظمیٰ کے باشندوں تک پہنچانا چاہیئے۔ اِس کی قدر و قیمت اُس وقت اور زیادہ ہو جاتی ہے جب یہ دیکھا جائے کہ ہندوستان کی یہ ساری جنگی مساعی رضاکارانہ اُصولوں پر ہوئی ہیں۔

دوسری طرف ہر شخص جانتا ہے کہ برطانیہ میں ہندوستان کے باشندوں کے ساتھ ہمدردی اور خیر سگالی کے جذبات عام ہیں برطانیہ کے ساتھ شراکت سے ہندوستان کو بہت فائدہ پہنچا ہے۔ ہٹلر کی زبردست طاقت کے مقابلہ میں برطانیہ جسطرح سینہ سپر ہوا اور اس کے باشندوں نے جسطرح اپنے آپ کو منظم کر کے آزادی کی خاطر کام شروع کیا اُسے ہندوستان میں ہر شخص نے تعریف کی نظر سے دیکھا ہے۔ ہندوستانیوں کو بڑی خوشی ہوگی اگر حبّ وطن اور اتحاد کی یہی روح ان کے دیس کی طرف منتقل کر دی جائے اِس کے علاوہ برطانیہ عظمیٰ کی ایک کلچرل (ثقافتی) حیثیت بھی ہے اور اس کا ہندوستان کے اپنے تہذیبی ورثہ میں سمویا جانا اور زیادہ اہم ہے۔ ہندوستان اور برطانیہ کے درمیان جو ذہنی رشتے ہیں انھیں مضبوط بنایا جا سکتا ہے۔ اور بنانا چاہیئے۔ افسوس کی بات ہے کہ وزارت اطلاعات نے ان تصویروں کو ہندوستان کے سامنے پیش کرنے کے بارے میں اب تک کچھ کام نہیں کیا ہے۔

مادی حیثیتوں سے اشتراک مقاصد اور مفاد کے علاوہ برطانیہ اور ہندوستان میں روحانی اور انسانی اعتبار سے کچھ قدرِ مشترک پائی جاتی ہے۔ جسے اگر

وضاحت کیساتھ بیان کیا جائے تو ہندوستان کے برطانوی دولت مشترکہ کے دائرہ کے اندر رہنے کی مزید تائید ہوتی ہے۔ ہندوستان میں سیاسی ہیجان کا جو طویل دور گزرا اور ملک کے اندر مختلف گروہوں کے درمیان جو آویزش ہوئی اس نے یہاں کے باشندوں کو اپنی حالت پر غور و تامل کا عادی بنا دیا ہے۔ ضرورت ہے کہ ہندوستان کا بڑا شراکت دار یعنی برطانیہ اسے یہ بتائے کہ ایشیائی امن و امان اور ایشیاء کی ترقی کے محور کی حیثیت سے ہندوستان کا برطانوی دولت مشترکہ کے جھرمٹ میں رہنا کتنا اہم ہے۔

برطانیہ کے حریت پسندانہ خیالات سے اب تک صرف انھی ڈومی نینوں کو فائدہ پہنچا ہے جہاں یورپی نسلیں آباد ہیں۔ بڑی بات ہوگی اگر ہندوستان کی طرح ایک دوسری نسل کے باشندوں کو بھی برطانیہ کے جمہوری ورثہ میں سے کچھ حصہ ملے اور برطانوی دولت مشترکہ اقوام کے مشترک نصب العینوں میں وہ بھی شریک ہو جائے۔

مذکورۂ بالا ملاحظات سے معلوم ہوتا ہے کہ حسب ذیل باتوں کی کتنی زیادہ ضرورت ہے:

(الف) اہل برطانیہ کو یہ بتانا کہ ہندوستانیوں نے اس جنگ میں کیا حصہ لیا ہے۔ لڑائی کے اثرات ان کے گھروں، ان کی معیشت اور زندگی کے بارے میں ان کے عام نقطۂ نظر پر کیا پڑے ہیں۔ اگر ہندوستان اپنے آدمیوں دولت اور سامان کو لڑائی کے لیئے وقف نہ کر دیتا تو وہ ان سے خود اپنی ترقی کے بارے میں کتنا اہم کام لے سکتا تھا۔

(ب) اہل ہندوستان کو یہ بتانا کہ برطانیہ کے باشندوں میں ہندوستان کے ساتھ ہمدردی اور خیرسگالی کے جذبات موجود ہیں۔ اس ہمدردی کو عملی جامہ پہنا کر برطانیہ کے باشندے ہندوستان کو اسکی چند اہم ترین مشکلات حل کرنے میں مدد دے سکتے ہیں مثلاً جہالت اور افلاس کا خاتمہ، حفظان صحت و صفائی کے انتظامات، رہنے کیلئے بہتر مکانات، زیادہ

خوراک اور کپڑا، اور زیادہ روزگار۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ لڑائی کے بعد برطانیہ کے باشندے اپنے قابل مردوں اور عورتوں کو ہندوستان بھیجیں تاکہ وہ خدمت اور باہمی امداد کے جذبہ کے تحت ہندوستانیوں کو ان مسائل کے حل کرنے میں مدد دیں؟

یہ ہیں وہ حقائق جو آج ہندوستان کے بین الاقوامی ماحول میں پائے جاتے ہیں وہ خطرات جو آج اسے درپیش ہیں اور وہ مفادات جن کی حفاظت کرنا اس کے لئے ضروری ہے۔ ہم نے ایک مشاہدہ کی طرح ان سب باتوں کو حتی الامکان واقعاتی حیثیت سے پیش کر دیا ہے۔ ہندوستان کا دستور اور سلطنت متحدہ[ا] کے ساتھ اس کے آئندہ انتظامات ایسے ہونے چاہئیں کہ خطرات پر قابو پایا جائے اور مفادات کی حفاظت ہو جائے۔ ان دونوں باتوں کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے اندرونی اور خارجہ مسائل کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

ہندوستان کے خارجہ مسائل کے بارے میں اتفاق رائے تو بہت کچھ ہے لیکن بدقسمتی سے ان میں بہت کم دلچسپی لی جاتی ہے۔ اس کے برخلاف اندرونی مسائل میں دلچسپی حد سے زیادہ ہے اور اتفاق رائے بہت کم۔ یہ دونوں مسائل صرف اس صورت اطمینان بخش طریقہ پر حل ہو سکتے ہیں کہ خارجی اور داخلی دونوں مسائل پر برابر کی توجہ دی جائے۔

ہندوستان کے خارجی تعلقات کے مطالعہ سے ہمیں اس کے گھریلو معاملات کی ترتیب اور سلطنت متحدہ کے ساتھ اس کے عہدنامہ کے بارے میں کیا قطعی

[ا] UNITED KINGDOM

ہدایت مل سکتی ہے ؟ اس سوال کا جواب یقیناً متنازعہ فیہ ہوگا، اس لئے کہ خارجی حالات کے جائزے سے جو نتیجہ نکلتا ہے وہ تو اپنی جگہ واضح ہے۔ لیکن جو لوگ صرف اندرونی صورت حالات سے بحث کرتے ہیں ان کی رایوں کی شدت اور انتہاپسندی یا تو حقیقت پر پردہ ڈال دیتی ہے یا اُسے توڑ مروڑ کر پیش کرتی ہے۔ بہرحال اس مقالہ کا مقصد یہی ہے کہ جو نتیجہ بھی نکلتا ہو اسے بے کم وکاست اور گھریلو معاملات سے جھجکے بغیر پیش کر دیا جائے۔ سب سے بڑا نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستان کی وحدت قائم رکھنا ازبس ضروری ہے۔ حفاظتی اور فوجی اعتبارات سے یہ بات ناگزیر ہے۔ عالمی مفاد کا تقاضا ہے کہ ہندوستان ایک بڑی طاقت بن جائے۔ دوسرا بلقان نہ بنے۔

ہندوستان کی وحدت کے راستہ میں کیا چیز حائل ہے ؟ اگرچہ یہ مقالہ گھریلو معاملات پر نہیں ہے لیکن چونکہ خارجی مسئلہ کو داخلی مسئلہ سے الگ نہیں کیا جا سکتا، اس لئے ہمیں آخرالذکر پر بھی ایک مختصر تبصرہ کرنا ضروری ہے۔

آٹھواں باب

بنیادی اندرونی مسئلہ - ہندو مسلم تعلقات

(الف) گزرے ہوئے خوش گوار زمانہ کی یاد

ہندوؤں اور مسلمانوں میں جو اختلافات آج پیدا ہوگئے ہیں، ڈر ہے کہ کہیں ان دو فرقوں کے اس تاریخی بھائی چارہ کو خاک میں نہ ملا دیں جو مغلوں کے زمانہ سے شروع ہوا اور صدیوں سے چلا آرہا ہے۔ یہ بات اکثر بھلا دی جاتی ہے کہ ہندوستان میں تفرقہ اندازی تاریخ سلطنت مغلیہ کے واحد تعمیری عنصر کی مخالفت کرنے کے مرادف ہے۔ بے شک آج کے ہندوستانیوں کی معلومات اپنے پرکھوں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہے۔ لیکن جب ان کے خیالات کو آریائی - سے راسی[51] تصور اتحاد کے وسیع تر پس منظر میں دیکھا جاتا ہے تو وہ ہیچ دپوچ معلوم ہوتے ہیں۔ پرانے زمانے کے ہندوستانی لیڈروں اور مفکرین نے ان دو مذاہب

ARYAN SARACENIC ۵۱

میں یک رنگی اور ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ داراشکوہ نے انھیں مجمع البحرین (دو ساگروں کا سنگھم) کہا ہے۔ کبیر اور نانک نے بھی انھیں آپس میں سمونے کی کوشش کی اور اپنی عبادتوں میں "اللہ رحیم اور رام" دونوں کے نام داخل کیے۔ ہندو اور مسلمان استادان فن نے بھی جذبہ ہم آہنگی سے متاثر ہو کر ایسے مشترکہ صنائع اور حرفے اختراع کیے، جو ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے دل کو لگتے تھے اور دونوں کی ضروریات پوری کرتے تھے: مسرت اور حسن کاری کے مشترکہ تصورات وجود میں لائے گئے۔ افسوس ہے کہ آج ہندوستانی اس تعمیر کی خرابی کے درپے ہے جو تاریخ نے اپنے ہاتھوں اس کے لئے بنائی تھی وہ اس تاریخ کو سمجھنے اور اس کی قدر کرنے کے اہل نہیں رہے اس لئے اب وہ اُسے بدنام کرتے پھرتے ہیں +

مقام تعجب ہے کہ اتنی مشترکہ باتوں کے باوجود آج ہندو مسلم اتحاد کا شیرازہ بکھرتا جاتا ہے۔ ہمارا فرض تو یہ تھا کہ ان باتوں سے کام لے کر اتحاد کی اساس بنیاد کو اور وسیع کریں۔ ہم نے اپنے اسلاف سے صرف موسیقی اور ادبیات مصوری اور فن تعمیر ہی کا مشترکہ تہذیبی ورثہ نہیں پایا ہے، بلکہ ہندوؤں اور مسلمانوں نے کئی جنگوں میں شانہ بشانہ لڑکر ہمارے لئے ایک مشترکہ سیاسی مقدر بھی بنا دیا تھا۔ علیٰ ہذا معاشرتی معاملات میں بھی ان دونوں فرقوں کے روایات اور رواج آپس میں رچے بچے تھے۔ شہنشاہ بابر کے زمانہ میں بھی زندگی کے مشترکہ طریقے وجود میں آچکے تھے چنانچہ بابر نے انہیں "ہندوستانی طریقوں" کے نام سے یاد کیا ہے، اور ان میں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی ملی جلی خصوصیات نظر آتی تھیں۔ پھر لشکر کی بولی کے اندر سے اُردو

زبان نے جنم لیا۔ خود مذہب کے بارے میں جو اس زمانہ میں عزیز ترین چیز سمجھا جاتا تھا، ایک کا اثر دوسرے پر پڑا۔ ہندو عوام کے مذہب میں مسلمانوں کے اثر سے ایک نیا رُخ اور ایک نیا رنگ پیدا ہوا اور خود اسلام پر بھی ہندوستانی رنگ چڑھ گیا۔

ہندوستان مسلمانوں کا بھی جنم بھوم قرار پایا۔ اس کی داغ بیل تو اسی وقت پڑ چکی تھی جب قطب الدین[1] نے دھلی کی سلطانی کو سلطنت غزنویہ سے الگ کر لیا تھا۔ اس بات کی صاف اور تاکیدی ہدایت کی گئی تھی کہ مسلمان بادشاہ اپنی رعایا کے مختلف طبقوں میں کسی قسم کا امتیاز روا نہ رکھیں۔ ان پر یہ واجب قرار دیا گیا تھا کہ وہ "ہر طریق مذہب کو یکساں چشم کرم سے دیکھیں اور ایک کے ساتھ سگی ماں کا اور دوسرے کے ساتھ سوتیلی ماں کا سلوک نہ کریں" بابر کی توزک کا ابوالفضل کی آئین اکبری سے مقابلہ کیا جائے تو ماتر بھومی کی حیثیت سے ہندوستان کے ساتھ محبت کے دل چسپ مدارج نظر آتے ہیں۔ بانی سلطنت مغلیہ (بابر) نے شکایت کی تھی کہ "ہندوستان ایسا ملک ہے جہاں بہت کم راحتیں میسر ہیں" لیکن اکبر کے تخت پر بیٹھنے تک نو واردوں کا یہ نقطہ نظر بدل چکا تھا۔ اس کا مورخ (ابوالفضل) "ہندوستان کے حسن" کی تعریف میں رطب اللسان ہے اور اپنے موضوع سے گریز کی معذرت ان الفاظ میں کرتا ہے :-

"اس کی وجہ وہ محبت ہے جو مجھے اپنے وطن کے ساتھ ہے"۔

---

[1] اکبر نامہ بیورج صہ Lxi ۲۸۵ - ۱۲

(ب) ہماری موجودہ یاس انگیز حالت!

ابوالفضل کے زمانہ کی طرح اَب بھی مسلمانوں نے ہندوستان کو اپنا وطن سمجھنا اور اس کے تصور سے فیضان حاصل کرنا نہیں چھوڑا ہے۔ ۱۹ جنوری ۱۹۴۰ء ہی کی بات ہے" کہ مسٹر جناح نے یہ الفاظ لکھے تھے:-

"مختصر یہ کہ ایک ایسا دستور بنایا جائے جو یہ تسلیم کرے کہ ہندوستان میں دو قومیں بستی ہیں، اور انھیں اپنے مشترکہ مادرِ بھومی (وطن مادری) کی حکومت میں حصہ ملنا چاہیئے"

بے شک مسٹر جناح کا دو قوموں کا نظریہ وجود میں آچکا ہے، لیکن مشترکہ وطن مادری کا تصور ابھی تک نہیں مٹا ہے اور مشترکہ حکومت میں حصہ اب تک جیتا جاگتا عقیدہ بنا ہوا ہے۔ اس کے دو مہینہ بعد ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو مسلم لیگ نے اپنے اجلاس لاہور میں پاکستان بنانے کا تصفیہ کیا۔ یہ خیال کہ ہندوستان مسلمانوں کا وطن مادری ہے اب بھی قائم ہے اس لئے کہ پاکستان کا تصور اسی پر مبنی ہے لیکن مشترکہ وطن مادری کا تصور اب باقی نہیں رہا ہے۔ پاکستان نے مسلمانوں کے وطن مادری کو مقامی بنا کر اسے صرف ہندوستان کے ان حصوں تک محدود کر دیا ہے جہاں آج انہیں اکثریت حاصل ہے، اور اس طرح مقامی بنا دینے کے بعد اب وہ دعوے کرتے ہیں کہ اسے بقیہ ہندوستان سے، جس کے گیت اقبال نے "ہندوستان ہمارا" کے عنوان سے گائے ہیں، الگ کر دیا جائے۔ پاکی کی صفت کا دارو مدار اس پر ہے کہ اس علاقہ میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔

اگر ایک طرف رام گڑھ میں مولانا ابوالکلام آزاد نے کانگریس کی صدارت

کہتے ہوئے "ایک متحدہ اور ناقابلِ تقسیم ہندوستانی قوم" کا ذکر کیا تو دوسری طرف لاہور میں لیگ کانفرنس کے صدارتی خطبہ میں یہ کہا گیا:۔

"یہ خیال کہ ہندو اور مسلمان کبھی ایک مشترکہ قومیت بنا سکیں گے محض ایک خواب ہے" ایک مشترکہ حکومت میں حصہ لینے کے خیال کو چھوڑ کر اس کی جگہ مسلمانوں کے لیئے ایک جداگانہ قومی حیثیت کا مطالبہ کیا گیا اور اب وہ ایک با اقتدار ریاست چاہتے ہیں ان کی رائے میں وفاق اب کسی کام نہیں رہا ہے۔

لیگ کی قرارداد میں جس کی تحریک فضل الحق صاحب نے کی تھی یہ مطالبہ کیا گیا۔

"ان علاقوں کو جہاں تعداد کے اعتبار سے مسلمانوں کی اکثریت ہے جیسے ہندوستان کے شمال مغربی اور مشرقی منطقے، آپس میں ملا کر ایسی "خود مختار ریاستیں" بنائی جائیں جن کے ترکیبی اجزا خود مختار اور با اقتدار ہوں"

لیکن نہرو رپورٹ پر ایک نظر بازگشت ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے مصنفوں کی مخالفت کرتے ہوئے خود مسلم لیگ نے وفاق (فیڈریشن) پر اتفاق کیا تھا۔ نہرو کمیٹی نے بہ غلبہ آرا، اپنا نصب العین "خود مختار ڈومی نینوں کے دستور" کو قرار دیا تھا اور ڈومی نین درجہ کے حصول کو "دوسرا فوری قدم" بتایا تھا کمیٹی میں یہ خواہش غالب تھی کہ ایک مضبوط مرکز (سنٹر) وجود میں لایا جائے جو ہندوستان کی وحدت کو موثر طریقہ پر قائم رکھ سکے، اور جو دستور انھوں نے تجویز کیا تھا وہ بھی وحدانی قسم کا تھا۔ وفاق پر کمیٹی نے سنجیدگی سے غور نہیں کیا تھا سائمن رپورٹ پر حکومت ہند کے مراسلہ (مورخہ ۲۰ ستمبر ۱۹۳۰ء) میں بھی کل ہند وفاق کو ایک بعید نصب العین قرار دیا گیا تھا۔ حکومت ہند کی رائے یہ تھی کہ۔

"اس قومی وحدت کے جذبہ کو جو مرکزی برطانوی نظم ونسق کے اثر سے

بتدریج پیدا ہو گیا ہے قربان کر دینا درست نہیں ہے۔"

نہرو رپورٹ کے مصنفین جداگانہ انتخابی حلقوں کے ساتھ اس رائے کو مطابق نہ کر سکے اور انھوں نے یہ سفارش کی کہ دس سال بعد اس کی (جداگانہ انتخابات) نظر ثانی کی جائے۔ غالباً ان کے ذہنوں میں وہ نظریہ تھا جو سر آسٹن چیمبرلین نے انجمن اقوام کی طرف سے پیش کیا تھا:۔

"جن لوگوں نے اقلیتوں کی حفاظت کا نظام بنانے کا تصفیہ کیا ہے ان کا یہ منشا ہرگز نہ تھا کہ کسی قوم کے اندر ایسا فرقہ قائم کر دیا جائے جو ہمیشہ ہمیشہ کے لیئے قومی زندگی سے الگ تھلگ رہے۔"

اس نظریہ پر عمل کرنے میں کمیٹی نے حد سے زیادہ منطق پرستی کا ثبوت دیا سیاسی سمجھوتے کے لیئے فوری ماحول کا لحاظ کرنا اور خود کو زمانہ کی ذہنی آب و ہوا سے مطابق کرنا ضروری ہوتا ہے۔

"سیاسیات میں عملی حل کے بارے میں جو جھگڑے پیدا ہو جاتے ہیں وہ مشکل سے سلجھتے ہیں اس لیئے کہ وہاں سوال کسی منصفانہ حل کو قبول کرنے کا نہیں ہوتا بلکہ یہ ہوتا ہے کہ اس انصاف کا درجہ کیا ہے۔"[۱]

نہرو رپورٹ کے خلاف جو رد عمل ہوا اس نے مسلم سیاسات کے دو حصوں کو جن میں سے ایک (مسلم کانفرنس) سر محمد شفیع کی قیادت میں تھا اور دوسرا (مسلم لیگ) مسٹر ایم اے۔ جناح کی زیر صدارت آپس میں متفق کر دیا اور یکم جنوری ۱۹۲۹ء کو ہز ہائنس آغا خان کی زیر صدارت یہ قرار پایا کہ صرف وفاقی نظام ہی "ہندوستانی حالات کو دیکھتے ہوئے موزوں ترین طرز حکومت ہے۔"

یہ یاد رکھنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ جس وفاقی اسکیم کا تصور قانون اصلاحات ۱۹۳۵ء میں کیا گیا تھا اسے آگے چل کر خود مسلم لیگ نے مسترد کر دیا۔

[۱] EDWARD BENES: DEMOCRACY TODAY AND TOMORROW P. 22

مذکورہ بالا قرارداد کی توثیق دوسرے سال یعنی ۱۹۳۰ء میں الہ آباد والے لیگ کے اجلاس میں کی گئی۔ مشہور شاعر سر محمد اقبال اس کے صدر تھے اور انہوں نے "شمالی مغربی ہندوستانی مسلم ریاست" کی تجویز پیش کی ان کی دلیل یہ تھی کہ چونکہ صوبوں میں آبادی کی موجودہ تقسیم مسلمانوں کے حق میں مضر تھی اس لئے جداگانہ انتخابی حلقوں کا طریقہ نکالا گیا تاکہ نمائندگی کا توازن مسلمانوں کے حق میں ہوجائے۔ اس مشکل کو نمائندگی کے اصول میں دخل اندازی کیئے بغیر یوں بھی حل کیا جاسکتا ہے کہ صوبوں کی ترکیب نئے سرے سے کیجائے۔ ان کی مجوزہ مسلم ریاست صرف ایک نئے صوبہ کا قیام تھا جو پہلے کی طرح ہندوستان ہی کا جز رہتا۔ اس سلسلہ میں یہ بھی بتادینا چاہیئے کہ نہرو کمیٹی نے بھی یہ تجویز پیش کی تھی کہ مسلم اکثریتوں کا ہندو اکثریتوں کے ساتھ توازن قائم رکھنے کیلئے صوبوں کی سرحدیں نئے سرے سے مقرر کیجائیں۔ صوبوں کی نئی ترتیب کی اس سے بھی زیادہ جامع اسکیم وہ ہے جو سر سکندر حیات خاں نے ۱۹۲۹ء میں اپنی کتاب
Outline of a scheme of Indian Federation
(وفاقی ہندوستان کی اسکیم کا خاکہ) میں بیان کی تھی اور جس پر انھوں نے ۱۱ر مارچ ۱۹۴۱ء کو پنجاب اسمبلی میں اپنی ایک تقریر میں بحث کی تھی۔ ان کا تصور یہ تھا کہ پورے ہندوستان کی نئے سرے سے علاقہ واری تقسیم کی جائے۔ تقریباً مساوی رقبہ رکھنے والے سات علاقے (REGIONS) ہوں جن کی آبادیاں متوازن ہوں جس سے ہر فرقہ کو منصفانہ نمائندگی مل سکے۔ ہر علاقہ کی اپنی اسمبلی ہو اور سب وفاقی اسمبلی کے ساتھ مربوط کردیئے جائیں۔ پروفیسر کوپلینڈ نے علاقوں کی تعداد بجائے سات کے چار کردی ہے، لیکن ان دونوں اسکیموں میں ایک مرکز کا تصور موجود ہے۔

آج ہم قسمت کے ایک عجیب چکر میں مبتلا ہیں۔ ہمارے ذہن میں یہ تکلیف دہ شبہات پیدا ہو رہے ہیں :- کیا ہم میں اتفاق و اتحاد کی صلاحیت کی عدم موجودگی اس وجہ سے ہے کہ ہم میں روشن خیالی نہیں ہے ؟ یا اس کی وجہ وہ حالات ہیں جن کے ماتحت ہم سے سمجھوتا کرنے کو کہا جاتا ہے ؟ یا ہماری خود غرضی کو اس میں دخل ہے ؟ بعض لوگ "ہندوستان چھوڑ دو" کے مطالبہ کو ہمارے ہر مرض کا علاج سمجھتے ہیں۔ بہت سے اسے ایک انتہائی قسم کا علاج سمجھتے ہیں جو مریض کو لب گور پہونچا دے گا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ "خدا یا نراج"[1] ہماری حفاظت کرے گا۔ تعجب ہوتا ہے کہ کیا واقعی حالات اتنے بگڑ چکے ہیں؟ کیا اس قسم کی مایوسی سے کسی سمجھوتے کی اُمید ہو سکتی ہے ؟ تاریخ تو یہی بتاتی ہے کہ بعض اوقات کسی صورت حالات کی انتہائی مایوسی اور شدید مشکلات ہی کے اندر سے نجات کی راہیں نکل آتی ہیں۔ "۱۶۸۹ء کے انگریزی سمجھوتے، ۱۷۰۷ء میں انگلستان اور اسکاٹ لینڈ کا اتحاد اور ۱۷۸۷ء میں ریاستہائے متحدہ امریکہ کا وجود میں آنا"[2] یہ سب اسی کی مثالیں ہیں۔

اس امر پر تو سب متفق ہیں۔ کہ طاقت انگریزوں کے ہاتھوں سے نکلکر ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں منتقل ہونی چاہیئے۔ لیکن اب تک اس بارے میں کوئی سمجھوتا نہیں ہو سکا ہے کہ طاقت کی یہ منتقلی کیونکر اور کس کی طرف ہو۔ اگر ایک مرتبہ اس "کیونکر" کے بارے میں سمجھوتا ہو گیا تو برطانیہ کی طرف سے جو بے اعتمادی ہندوستان میں ہے وہ ایسے غائب ہو جائے گی جیسے سورج نکلتے ہی کہر پھٹ جاتی ہے۔ ہمارا مطالبہ یہ تھا کہ ہمیں اپنا دستور مرتب کرنے اور

---

[1] ANARCHY   [2] COUPLAND III 1.178

اپنی تاریخ خود تعمیر کرنے کی آزادی دیجائے۔ یہ آزادی کرپس کی تجاویز میں موجود ہے بشرطیکہ ہم اس سے فائدہ اٹھانا چاہیں۔ ہم ہی آئندہ نسلوں کی بے زبان توقعات کے امین ہیں۔ بعد جنگ کی عالمی برادری کی آنکھیں ہم پر لگی ہوئی ہیں۔ کیا یہ کام ہندوستان کے بڑے بڑے فرقوں اور برطانیہ عظمیٰ کی قوت سے باہر ہے؟

(ج) حکومت خود اختیاری کی جد وجہد میں "خود" کا مرتبہ

یہ واقعہ ہے کہ قوت اور اختیار کا جو پہلا ریزہ انگریزوں نے ہندوستان کو دیا، اسے دیکھتے ہی ہندوؤں اور مسلمانوں کے سیاسی اتحاد کا شیرازہ بکھرنا شروع ہو گیا۔ سوال یہ تھا کہ حکومت خود اختیاری کی صورت میں خود کا اشارہ کس کی طرف اور کس حد تک تھا؟ غرض کہ فرقہ وارانہ مناقشات اصل میں دستوری اصلاحات ہی کا ضمیمہ تھے۔ آیئے ان کی تاریخ پر غور کریں اور دیکھیں ایک کو دوسرے کے ساتھ کیا نسبت رہی ہے۔

سنہ ۱۸۳۳ء کے چارٹر ایکٹ میں ایک ایسے مستقبل کا تصور باندھا گیا تھا جب کہ ہندوستان نمائندہ حکومت کے قابل بن جائے گا۔ لیکن اُس وقت سوائے اس کے کہ بعض اعلیٰ سرکاری ملازمتوں کے دروازے ہندوستانیوں کے لئے کھول دیئے جائیں اور کچھ ہندوستانیوں کو نہ ملا۔ غدر کے بعد سنہ ۱۸۵۸ء کے قانون کی رو سے ہندوستان کی حکومت ایک تجارتی کمپنی کے ہاتھوں سے نکل کر برطانوی پارلیمنٹ کے ہاتھوں میں بہ دے دی گئی۔ اس کے تھوڑے عرصے کے بعد سنہ ۱۸۶۱ء کے قانون کی رو سے خواہ چھوٹے پیمانہ ہی پر سہی لیکن دستورِ ہند میں یہ اصول تسلیم کر لیا گیا کہ حکومت ہند میں ہندوستانیوں کو بھی شریک

کیا جائے۔ ۱۸۸۵ء میں وائسرائے وقت لارڈ ڈفرن کی سرپرستی اور نیک تمناؤں کے ساتھ انڈین نیشنل کانگریس وجود میں آئی۔ اس کے پہلے اجلاس میں ہندوستان کی آبادی میں قومی اتحاد کے منظر پر بڑی فصیح و بلیغ تقریریں ہوئیں۔ ۱۸۹۲ء کے کونسل ایکٹ کی روسے، اگرچہ برائے نام سہی، پھر بھی کونسل کی رکنیت میں اضافہ اور اس کے مباحث کے اختیارات میں توسیع کی گئی۔ تقسیم بنگال کے بعد سے حکومت اور کانگریس کی راہیں الگ الگ ہوگئیں، خود کانگریس میں بھی سورت کے مناقشہ (THE SURAT SPLIT) کی وجہ سے پھوٹ پڑ گئی اور انتہا پسندوں اور اعتدال پسندوں کی ٹکڑیاں الگ الگ ہوگئیں۔

قانون ۱۹۰۹ء جس کی روسے منٹو۔ مارلے اصلاحات نافذ ہوئے۔ ہندوستان کی دستوری تاریخ میں ایک نئے اور نازک دور کا نقطہ آغاز ہے جداگانہ انتخابی حلقوں کے ذریعہ فرقہ وارانہ نمائندگی کا جو طریقہ اس قانون سے نافذ ہوا وہ جمہوریت کے بنیادی اُصولوں کے خلاف تھا۔ مسلمانوں کا ایک وفد وائسرائے وقت لارڈ منٹو سے ملا۔ وفد نے یہ مطالبہ کیا کہ مسلمانوں کی تاریخی اہمیت اور سلطنت برطانیہ کی جو خدمات انھوں نے کی ہیں ان کی بنا پر مسلمانوں کو ان کے تناسب سے زیادہ نمائندگی ملنی چاہیے۔ اس حد تک تو یہ مطالبہ معقول اور منصفانہ تھا، لیکن جداگانہ نمائندگی کے طریقہ نے دونوں فرقوں کے درمیان روز افزوں علیحدگی کا بیج بو دیا اور اب یہ علیحدگی اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ یہ طریقہ بھی ناکافی ثابت ہو رہا ہے۔ ایک ایسا صحیح اور منصفانہ مقصد جس طرح غلط طریقے اختیار کرنے کی وجہ سے برباد ہوا ہے اس کی مثال شاذ ہی تاریخ میں ملتی ہو۔

پہلی جنگ عظیم کے دوران میں جب ہندوستان کو مزید اصلاحات دیئے جانے کے چرچے ہو رہے تھے، ہندوستانی لیڈروں نے اپنے گھر کی حالت درست کرنے کی سچے دل سے کوشش کی۔ دسمبر ۱۹۱۶ء میں مسلم لیگ کانفرنس کے اجلاس لکھنؤ کی صدارت کرتے ہوئے مسٹر جناح نے اپنے تاثرات ان الفاظ میں بیان کئے:۔

"مغربی تعلیم کے اثر سے نئے ہندوستان میں تیزی سے خیالات، مقصد اور نقطہ نظر کی وحدت اور ہم آہنگی پیدا ہوتی جا رہی ہے۔"

اسی زمانہ میں لکھنؤ میں کانگریس کا اجلاس بھی ہو رہا تھا، اور کانگریس اور لیگ کے درمیان وہ مشہور معاہدہ ہوا جس کو اب "معاہدہ لکھنؤ" (LUCKNOW PACT) کہا جاتا ہے۔ اس زمانہ کے حالات میں "جداگانہ انتخابی حلقوں کو ختم کر دینا تو ممکن نہ تھا، لیکن پھر بھی دونوں فریقوں نے اعلیٰ درجہ کی سوجھ بوجھ اور باہمی رواداری کے جذبہ کا ثبوت دیا۔ کانگریس نے بھی حسب موقع فرض شناسی سے کام لے کر مسلمانوں کو نسبتاً بڑھ چڑھ کر مراعات دیں۔ مارلے۔منٹو اسکیم کی رو سے مسلمانوں کی نمائندگی بنگال میں ۴۰۔۱۰ فیصدی اور پنجاب میں ۲۵ فیصدی رکھی گئی تھی لکھنؤ معاہدہ میں یہ تناسب بڑھا کر بنگال میں ۴۰ فیصدی اور پنجاب میں ۵۰ فیصدی کر دیا گیا۔ اپنی اقلیت والے صوبوں میں بھی مسلمان اسی طرح فائدے میں رہے مثلاً یو۔پی میں جہاں ان کی آبادی ۱۴ فیصدی ہے انھیں ۳۰ فیصدی نمائندگی دینا منظور کیا گیا۔ مرکز میں ایوان کی منتخب شدہ نشستوں میں سے ایک تہائی نشستیں مسلمانوں کو دیئے جانے کا فیصلہ ہوا، اور کانگریس کے دستور میں یہ شرط لکھ دی گئی کہ کوئی مسودہ قانون جس سے کوئی فرقہ متاثر ہوتا ہو اس وقت تک زیر غور نہ آئے گا جب تک کہ متعلقہ فرقہ کے ¾ منتخب شدہ اراکین اس پر رضامند نہ ہوں۔

اصلاحات ۱۹۱۹ء کے مصنفین نے لکھنؤ کے سمجھوتے کو "قومی احساس کی روزافزوں قوت کی شہادت" قرار دیا اور اسے خوش آمدید کہا۔ اور اگرچہ انھوں نے "جداگانہ انتخابی حلقوں" کی برقراری کو برا بتایا۔ لیکن مفادات کی یہ تفریق قانونِ اصلاحات میں قائم رکھی اگرچہ اس کی دفعات لکھنؤ معاہدہ کی شرائط سے مختلف تھیں۔

اس درمیان میں کانگریس پر انقلابی نقطہ نظر غالب آگیا اور رولٹ ایکٹ (ROWLATT ACT) سے اسے اور سہارا ملی۔ مسٹر گاندھی نے کانگریس کی لیڈری اپنے ہاتھ میں لے لی اور عدم تعاون کی پالیسی شروع ہوگئی۔ تھوڑے عرصہ کے لیے مسئلہ خلافت کے سلسلہ میں مشترکہ عدم تعاون کی صورت میں ہندو مسلم اتفاق رونما ہوا۔ لیکن جب مصطفےٰ کمال پاشا نے خلافت کو توڑ ڈالا تو یہ اتفاق بھی بے نتیجہ ثابت ہوا اور اب شدید فرقہ وارانہ فسادات کی گرم بازاری ہوئی۔ جب کبھی عدم تعاون کی تحریک شروع ہوتی، ساتھ ہی فرقہ وارانہ فسادات بھی پیدا ہوجاتے۔ ۲۹ راگست ۱۹۲۷ء کو ہندوستانی مجلس مقننہ سے خطاب کرتے ہوئے لارڈ اِروِن (IRWIN) نے اتفاق اور اتحاد کی اپیل کی۔

کانگریسیوں کے ایک گروہ نے "سوراج پارٹی" بنالی تھی جو مجالس مقننہ کے اندر رہ کر ان کے توسط سے دستورِ ہند پر کامیابی کے ساتھ حملے کرتی رہتی تھی یہی لڑائی بنگال کی مقننہ میں مسٹر سی۔ آر۔ داس بڑی دھوم دھام سے لڑ رہے تھے۔ جب نومبر ۱۹۲۷ء میں لارڈ برکن ہیڈ (BIRKIN HEAD) نے سائمن کمیشن مقرر کیا تو اس کا اعلان کرتے ہوئے لارڈ اِروِن نے کہا "حال میں قانون کے قبل از وقت نفاذ کے بارے میں بہت خاصا زور ڈالا گیا ہے"۔

اس عرصہ میں کچھ تو اس چیلنج کے جواب میں جو لارڈ برکن ہیڈ نے

ہندوستانی تعمیری سیاسیات کے مفکرین کو دبا تھا، اور کچھ ملک کو اصلاحات کی آنے والی قسط کے واسطے تیار کرنے کے لئے قوم پرست نیشنلسٹ، لیڈروں نے ہندوستان کے لئے ایک دستور کا مسودہ بنانے کا کام شروع کر دیا۔ اور ۱۹۲۸ء میں پنڈت موتی لال نہرو کی صدارت میں ایک کمیٹی اس کام کے لئے بنا دی گئی ان لوگوں نے ہندوستان کو ڈومی نین درجہ دیئے جانے کی تائید میں مسودہ تیار کیا۔ ۳۱ اکتوبر ۱۹۲۹ء کو تقریر کرتے ہوئے لارڈ ارون نے حکومت برطانیہ کے ایما سے یہ اعلان کیا کہ ڈومی نین درجہ ماونٹ فورڈ اصلاحات میں مضمر ہے۔ وائسرائے کا یہ اعلان اس وجہ سے اور بھی ضروری تھا کہ ڈومی نین درجہ کے بارے میں سائمن کمیشن کے سکوت نے غلط فہمیاں پیدا کر دی تھیں۔

اس کے بعد دوسری بساط لندن میں بچھائی گئی۔ وہاں ہندو، مسلمان، والیان ریاست اور برطانوی نمائندے راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں جمع ہوئے تاکہ مشکلات پر تبادلہ خیال کریں اور ایک ایسا قابل عمل دستور مرتب کریں جس سے ہندوستان کی سیاسی اُمنگیں پوری ہوں اور برطانیہ کے مفادات اور ذمہ داریوں کے ساتھ ان کا تطابق ہو جائے۔ اس کانفرنس نے جس کا نقطہ نظر اعلیٰ محنت زبردست اور لگن سچی اور مُسلّم تھی حیرت انگیز جوش اور انہماک کے ساتھ اپنا کام شروع کر دیا۔ لیکن اس کے باوجود راونڈ ٹیبل کانفرنس تاریخ کا کوئی نیا باب شروع نہ کر سکی۔ البتہ کچھ نہ کچھ کامیابی اسے ضرور ہوئی۔ وفاق اس شرط کے ساتھ کہ اس کا عملی نفاذ اسی صورت میں ہوگا جب کہ ریاستوں کی ایک مقررہ تعداد بھی اس میں شامل ہو جائے، ہندوستان کے مطمح نظر کے طور پر قبول کر لیا گیا۔ صوبوں کو فوراً حکومت خود اختیاری دے دی گئی، اور دو عملی (DIARCHY) حکومت ختم کر دی گئی +

یہ سب کچھ ہوا، لیکن ہندوستانی مسئلہ کی جان فرقہ وارانہ سوال تھا۔
اس سلسلہ میں کانفرنس کا کام مایوس کن بلکہ دل شکن ثابت ہوا۔ مسئلہ کے
حل کے تمام ممکنہ ذرائع پر غور کرنے کے لئے ایک اقلیتوں کی کمیٹی مقرر کی گئی۔
مسلمان پنجاب اور بنگال کی مقننہ میں ایک ایک نشست زیادہ مانگتے تھے اور
اس کے معاوضہ میں مشترکہ انتخاب قبول کرنے کے لئے تیار تھے، لیکن دوسری
راونڈ ٹیبل کے ہندو اور سکھ نمائندوں نے ان کی پیش کش مسترد کر دی۔ یہ ایک
ایسی حماقت تھی جس کی تلافی مشکل سے ہو سکتی ہے۔ اگر مسلمانوں کی پیش کش منظور
کر لی جاتی تو آج ہندوستان کی تاریخ ہی دوسری ہوتی۔ مسٹر گاندھی کانگریس
کی طرف سے پورے اختیارات لئے ہوئے اس کانفرنس میں موجود تھے لیکن
آخر میں انھیں اعتراف کرنا پڑا "کہ میں فرقہ وارانہ مسئلہ کا متفقہ حل ڈھونڈتے میں
بری طرح ناکام ہوا ہوں"۔ تاہم انھوں نے اس پر زور دیا کہ فرقہ وارانہ سمجھوتے
کے انتظار میں دستور سازی کا کام بند نہ کیا جائے اور جب دستور بن جائے
تو فرقہ وارانہ سوال ایک عدالتی ٹربیونل (ثالثی) کے سامنے رکھ دیا جائے۔
مسلمان، پست اقوام اور دوسرے عناصر کانگریس کے خلاف متحد ہو گئے اور
آپس میں "اقلیتوں کا معاہدہ" کر لیا اور "جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب" اور "وزن
نمائندگی"[ل] کے لئے لڑنے کی ٹھان لی۔ آخر میں حکومت نے اقلیتوں کی نمائندگی کی ایک
عارضی اسکیم تیار کی اور اگست ۱۹۳۲ء میں راونڈ ٹیبل کانفرنس میں وزیر اعظم
انگلستان نے "کمیونل ایوارڈ"[۲] کے نام سے اس کا اعلان کیا:۔
جہاں تک پست اقوام کا تعلق ہے "معاہدہ پونا" (POONA PACT)

[ل] WEIGHTAGE یعنی تناسب تعداد سے زیادہ نمائندگی ۱۲

[۲] COMMUNAL AWARD فرقہ وارانہ بٹوارہ ۱۲

(۲۵ ستمبر ۱۹۳۲ء) کی رو سے کمیونل اوارڈ میں ترمیم کی گئی۔ اور یہ تحریک بھی پیش کی گئی کہ کمیونل اوارڈ کی بجائے ایک فرقہ وارانہ سمجھوتا کر لیا جائے، چنانچہ پنڈت مالویہ کی صدارت میں ایک اتحاد کانفرنس منعقد کر کے اس کی کوشش بھی کی گئی، لیکن یہ کانفرنس بھی ناکام رہی اور اس کی ناکامی کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک نئی پارٹی، "نیشنلسٹ پارٹی" کے نام سے قائم ہوگئی جس نے کانگریس کے نقطہ نظر کی مخالفت میں جو کمیونل اوارڈ کو "نہ تو مانتی تھی اور نہ رد کرتی تھی" اس کی مخالفت کو اپنا مقصد قرار دیا۔ ہندو مہاسبھا نے بھی اسی اوارڈ کی مخالفت میں اپنا پلیٹ فارم قائم کیا لیکن "اس کا سارا نقطہ نظر محض یہ تھا کہ ہندوؤں کو کیا ملا اور کیا نہیں ملا"۔[۵]

کانگریس ۱۹۳۵ء کی اصلاحات سے ذرا بھی خوش نہ تھی۔ اگر ایک طرف لیگ صوبہ واری خود اختیاری کو آزما دیکھنا چاہتی تھی تو دوسری طرف کانگریس نے صرف دستور کو "ملیا میٹ" کرنے کے لئے انتخابات لڑنے کا تصفیہ کیا۔ انتخاب میں کانگریس کو مدراس، اوڑیسہ، بہار، یو۔پی، صوبہ سرحد سی۔پی، اور بمبئی میں اکثریت حاصل ہوئی۔ حسب دستور کانگریس کو وزارتیں بنانے کی دعوت دی گئی۔ انھوں نے مطالبہ کیا کہ پہلے یہ عدہ کر لیا جائے کہ عملی طور پر گورنر یا گورنمنٹ "تحفظات" کو استعمال نہ کریں گے۔ مسلمانوں نے یہ خیال کیا کہ اس مطالبہ کا منشا یہ ہے کہ ان کی ضرورت کے موقع پر بھی تحفظات استعمال نہ ہوں۔ گورنروں نے پہلے تو اقلیتوں کی وزارتیں بنائیں، پھر کانگریس کو یقین دلایا کہ چھوٹے موٹے اور روزمرہ کے معاملات میں تحفظات استعمال

۵؎ پنڈت نہرو ۲۹ر نومبر ۱۹۳۳ء ۱۲

نہ ہوں گے اور آخر میں ان عارضی وزارتوں کی جگہ کانگرسی وزارتیں بن گئیں اب کانگریس نے اپنی "رابطہ عوام" (MASS CONTACT) والی تحریک شروع کر دی جس کے بارے میں یہ سمجھا گیا کہ کانگریس دیہاتوں کے مسلمانوں پر کانگریسی رنگ چڑھانا چاہتی ہے چنانچہ مسلمانوں نے اس کی مخالفت کی اور پے در پے کئی ضمنی انتخابات جیتے۔ کانگریس نے مخلوط وزارتیں بنانے سے انکار کر دیا اور خالص کانگریسی وزارتیں قائم رکھیں۔ اس کا مطلب یہ سمجھا گیا کہ کانگریس انتظامی طاقت اور انتظامی مشینری کی اجارہ دار بننا چاہتی ہے۔

یہ تھے وہ نفسیاتی اثرات جو کانگریس کی بعض سرگرمیوں کی وجہ سے پیدا ہوئے۔ اصولی طور پر، اور جماعتی طریقہ حکومت (پارٹی سسٹم) کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو کانگریسیوں پر کوئی الزام عاید نہیں ہوتا لیکن اس میں شک نہیں کہ اخلاقی اور مصلحتی نقطہ نظر سے انھوں نے بہت بڑی غلطی کی۔ انھوں نے جو رویہ اختیار کیا وہ ہر پارٹی حکومت میں لازمہ کی حیثیت رکھتا ہے اور ہیلی فیکس (HALIFAX) کے اس قول کی ایک مثال ہے کہ "بہترین پارٹی قوم کے خلاف ایک سازش کی حیثیت رکھتی ہے۔" کانگریس کو اپنا دیہاتی مورچہ زبردست بنانے کی جو فکر ہوئی وہ اس وجہ سے کہ ان کے ذہنوں پر تیسرے فریق کا ہوا سوار تھا اور جو کچھ مال انھیں ملنا تھا تیسرے فریق ہی سے مل سکتا تھا۔ اسی لئے انھوں نے دوسری پارٹی کی رضا جوئی کو ضروری نہ سمجھا ان کا ارادہ تھا کہ تیسری پارٹی پر چھا جائیں اور اسی نیت سے کانگریس نے "مال وصول کرنے"[1] کی ٹھان لی۔

---

[1] DELIVERY OF GOODS یعنی اختیارات حکومت کی وصولی ۱۲۔ مترجم

"اگر برطانوی حکومت یہ جان لے کہ ملک میں کوئی ایک پارٹی اتنی مضبوط ہے جو ان سے "مال وصول" کرسکتی ہے تو وہ کسی متفقہ سمجھوتے کا مطالبہ نہ کرے گی۔ یہ ماننا پڑتا ہے کہ کانگریس میں آج اتنی طاقت نہیں ہے۔ اس نے اپنی جو کچھ حیثیت آج بنائی ہے وہ مخالفت کے باوجود بنائی ہے۔ اگر وہ کمزور نہ پڑ جائے اور صبر سے کام لے تو اتنی طاقت پیدا کرسکتی ہے کہ "مال وصول" کرسکے"[1]

صوبوں میں کانگریسی وزارتوں کا جو مخالف قومیت رد یہ رہا اس نے ان کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی۔ مسلمانوں میں یہ احساس پیدا ہو گیا کہ کانگریسی راج ان پر ظلم و ستم توڑ رہا ہے۔ ان کے جذبات مشتعل ہو گئے۔ مسٹر جناح نے یہ مطالبہ کیا کہ کانگریس کے "مظالم" کی تحقیقات کے لئے ایک شاہی کمیشن مقرر کیا جائے، لیکن حکومت نے اسے منظور نہ کیا، مسلم لیگ کی طرف سے "پیر پور رپورٹ" اور "شریف رپورٹ" شائع کی گئیں جن میں ان مظالم کی فہرست دی گئی تھی۔ ہمیں ان رپورٹوں سے بحث نہیں ہے، لیکن یہ ماننا پڑتا ہے کہ مسلمانوں میں بے اطمینانی پیدا ہو گئی تھی۔ یہ ایک قابل غور واقعہ ہے کہ جب کانگریسی وزارتوں نے استعفے دیئے تو مسٹر جناح کے حکم سے سارے ہندوستان میں "یوم نجات" منایا گیا۔ یہ بات بھی کچھ کم اہم نہیں ہے کہ اقلیتوں والے صوبوں کا خصوصاً یو۔ پی اور بہار کا مسلمان پاکستانی عقیدے کے اظہار میں سب سے زیادہ بلند بانگ ہے، حالانکہ اسے اس سے نقصان ہی پہنچ سکتا ہے، فائدہ نہ ہوگا۔ واقعہ یہ ہے کہ کانگریسی وزارتوں کے قابل شرم دور

---

[1] ہریجن، مورخہ ۱۵ / جون سنہ ۱۹۴۰ء ۱۲

سے مایوس ہوکر ہی مسلمان بے تحاشا ہندوستان کی با اقتدار ریاستوں میں تقسیم کے غار کی طرف دوڑ پڑے۔

(د) جماعتی حکومت ہندوستان کے لئے غیر موزوں ہے

اصل میں صوبوں میں کانگرسی انتظام حکومت ہی کو دیکھ کر مسلمانوں کے دل میں یہ شبہ قائم ہوا کہ اس قسم کی جمہوریت جیسی کہ برطانیہ سے یہاں آئی ہے، یعنی پارٹی سسٹم، ہندوستان کے لئے موزوں نہیں ہے۔ کچھ ہندوستان ہی پر منحصر نہیں ہے، بلکہ یہ بات عام طور پر بھی درست ہے۔[۵۱]

> "یہ بات ہم سب کو تسلیم کرنی چاہیے کہ پارٹیاں جمہوریت کا ایک لازمی ذریعہ ہیں، لیکن ہوسکتا ہے کہ ذریعہ ہی مقصد قرار پا جائے چنانچہ جب انتخاب کنندگان پارلیمنٹ اور کابینہ۔ یہ سب کے سب مختلف طریقوں سے پارٹیوں کی ضروریات کے تابع اور ان کے زیر اثر ہو جاتے ہیں تو یہی ہوتا ہے جس طریقہ سے، اور جس عمل سے گزر کر ذریعہ مقصد بنجاتا ہے ویسے ہی طریقوں سے جزو بھی کل قرار دے لیا جاتا ہے اور وہ حیثیت اختیار کرلیتا ہے جسے آج کل "کُل" یا "کُلی" کہا جاتا ہے۔"[۵۲]

جمہوریت کے بنیادی اصولوں سے، جو دراصل اخلاقی بھی ہوتے ہیں کسی کو اختلاف نہیں ہوسکتا۔ لیکن ہماری ضرورتوں کے لئے جمہوریت تب ہی موزوں ہوسکتی

ERNEST BAKER: REFLECTION ON GOVERNMENT P. 8 [۵۱]
TOTALITARIAN [۵۲]

ہے جب کہ اس کی بعض شکلیں تبدیل کر دی جائیں۔ انیسویں صدی کے دوسرے عشرہ میں پارلیمنٹوں کو ہر برائی کا علاج سمجھا جاتا تھا، اب یہ مان لیا گیا ہے کہ وہ کچھ برائیوں کی جڑ بھی ہوتی ہیں"[۵۱] اگر ناکام نہ سہی تو کم از کم بیمار جمہوریتوں کی پیدا کی ہوئی قوتوں کی روک تھام کے لئے ایک عالمگیر جنگ تو پہلے لڑی جا چکی ہے، اور دوسری اب جاری ہے۔ اب بھی اکثر ملکوں میں جمہوریت صاحب جائداد ووٹروں کا ڈھکوسلا ہے۔ عوامی جمہوریت ابھی پردۂ عدم میں ہے، اور جب وہ جنم لے گی تو ہمیں امید ہے کہ معدودے چند افراد کو برسر اقتدار لانے کے لئے ووٹ دینے کی بجائے حتی الوسع سب آدمیوں کو روٹی دلانے کے لئے ووٹ کا استعمال کیا جائے گا۔ یورپ کی سربرآوردہ جمہوریتوں کا فرض ہے کہ وہ اسی نتیجہ کو حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ اس کے لئے جمہوریت کی پوشیدہ قوتوں کو برسرکار لانا ہوگا اور دوربینی سے کام لینا ہوگا۔

"دنیا کے بدلے ہوئے حالات کی مناسبت سے جمہوریت کے مسئلہ پر بھی دوبارہ غور و خوص کی ضرورت ہے . . . . جمہوریت مکمل اسی صورت میں ہو سکتی ہے جب زندگی کے اقتصادی، سماجی اور دوسرے پہلو بھی اس کے حلقہ اثر میں آجائیں . . . . . . سچی جمہوریت کی نظر میں ہر انسان جو دنیا میں آتا ہے کچھ نہ کچھ پیدائشی حق ضرور رکھتا ہے۔ یعنی صحت، طاقت عقل، گوناگوں تفریحات اور آزادانہ دلچسپیوں کا پیدائشی

---

۵۱ GRANT AND TEMPERLY: EUROPE IN THE NINETEENTH AND TWENTIETH CENTURIES

حق۔اگر وہ سوسائٹی جس میں وہ پیدا ہوا ہے جمہوری ہونے
کا دعوےٰ رکھتی ہے تو وہ اس کے حق سے اسے محروم نہیں رکھ
سکتی، اور نہ اسے دبا سکتی ہے"[۱]

جس طرح نمائندگی کے نظام سے گزر کر کانگریس نے "ایک پارٹی کی حکومت"
پر اپنا سارا زور صرف کر دیا، اسی طرح اکثریت کے خوف نے مسلمانوں کو
جداگانہ انتخابات کی بجائے 'دو قوموں' کے نظریہ اور 'پاکستان کی طرف
بڑھنے پر مجبور کر دیا لیکن یہ ایک عجیب وغریب بات ہے کہ جب مسلمان
پاکستان مانگتا ہے تو وہ گویا خود اپنے واسطے اکثریت کی حکومت طلب
کرتا ہے، اور اس سے بھی عجیب تر یہ کہ پاکستان سے گزر کر وہ ہندوؤں کے
ساتھ یہ معاہدہ کرنا چاہتا ہے کہ دونوں مل کر انگریز پر حملہ کر دیں۔

"آخر ملک یہ مطالبہ کیوں نہ کرے کہ "مل جاؤ اور انگریز کو نکال باہر
کرو" اگر ہم ایک متحدہ ہندوستان کی حیثیت سے طاقت حاصل
نہیں کر سکتے تو ہمیں چاہیے کہ غیر متحدہ ہندوستان کی حیثیت سے
اسے حاصل کریں"[۲]

(ھ) تعطل کا سبب بے اعتباری

ہندو مسلم اختلافات کے اس پس منظر میں ہمیں ہندوستان اور برطانیہ
کے مسئلہ پر غور کرنا چاہیے۔ اس مسئلہ نے بھی ایک قسم کی پریشانی اور خوف

---

[۱] JULIAN HUXLEY ON LIVING IN A REVOLUTION

[۲] مسٹر جناح ٹائمز آف انڈیا۔ مورخہ ۲۶ اپریل ۱۹۴۳ء

پیدا کر دیا ہے :-

"سلطنت کے بطن سے ہمیشہ نئی ریاستیں پیدا ہوتی رہی ہیں، لیکن پرانے زمانہ میں اکثر اولاد ماں کو نوچ کھسوٹ لیتی تھی۔ جدید زمانہ میں سلطنت کو سب سے زیادہ فکر اس کی ہے کہ اس طرح کا انتشار اور پراگندگی پیدا نہ ہونے پائے، اور ایسے طریقے ڈھونڈھ نکالے جائیں کہ اپنی سیادت بھی قائم رہے اور نہ تو بغاوت ہو، اور نہ اپنا زوال؛ مثلاً ہندوستان کے ساتھ سلطنت برطانیہ کا موجودہ رویہ اسی قسم کا ہے۔"[۱]

سلطنت کی شیرازہ بندی اسی وقت قائم رہے گی جب کہ وہ اصول جس نے یہ سلطنت جیتی تھی سرگرم کار رہے۔ وہ اصول یہ ہے :-

"ہندوستان کو برطانوی سیرت (کیریکٹر) نے جیت لیا۔"[۲]

ہیگل (HEGEL) کی رائے تھی کہ برطانیہ نے دنیا کو مہذب بنانے کا مشن اپنے ذمہ لیا ہے، اور اس کا موقع اسے ان روابط سے ملا جو اپنی پھیلتی ہوئی تجارت کے سلسلے میں اس نے قائم کئے اور جاری رکھے۔ ہندوستان میں اسے زبردست کامیابی حاصل ہوئی :-

"ہندوستانی نوجوان چونکہ ہماری ادبیات کے توسط سے ہم سے مانوس تھے، اس لئے انھوں نے ہمیں غیر ملکی سمجھنا چھوڑ دیا۔ وہ ہمارے بڑے آدمیوں کا ذکر اسی جوش و خروش سے کرتے ہیں جیسا کہ ہم خود"[۳]

---

۱ R. M. MACLVER: THE MODERN STATE

۲ مقولہ ایمرسن، نقل کردہ مارکوکس آف زٹلینڈ: STEPS TOWARDS INDIAN HOME RULE

۳ SIR CHARLES TREVELYAN: POLITICAL TENDENCIES OF DIFFERENT SYSTEMS OF EDUCATION IN INDIA
ایک مقالہ جو ۱۸۵۲ء میں پارلیمنٹری کمیٹی کے سامنے پڑھا گیا

اگر سیاسی ربط و ضبط نے برطانوی ہندوستان پیدا کر دیا، تو کلچرل روابط سے جدید ہندوستان وجود میں آیا۔ گوکھلے کے پایہ کے لیڈر برطانیہ کی تہذیب آفرین صفات پر کامل عقیدہ رکھتے تھے، لیکن ہوا کا رُخ بدل گیا۔ لارڈ برکن ہیڈ نے، جنھوں نے اپنے سائمن کمیشن کا بائیکاٹ ہو جانے دیا تھا، ہندوستانی سیاست کاروں کا ذکر ان الفاظ میں کیا تھا:۔

"ہندوستانی سیاست کار زیادہ تر مغربی تعلیم کے اسی مذہب کے سبق یافتہ ہیں جس کی طرف سے وہ آج کل اپنی نفرت اور بیزاری کا ڈھونگ رچاتے ہیں۔" ؎۱

آخر ہوا کا رُخ کیوں بدلا؟ کہاں گوکھلے، کہاں گاندھی، اس تبدیلی کی کچھ تو توجیہ ہونی چاہیئے۔

یہ توجیہ ہمیں "تعلقات کی تاریخ" میں ملتی ہے۔ یہ سر اسٹیفورڈ کرپس کے الفاظ ہیں جنھوں نے ان واقعات سے جو انھیں درپیش ہوئے سبق حاصل کیا ہے۔ پچھلے بیس برس کی تاریخ نے جو الجھاؤ پیدا کر رہے تھے انھیں دور کرنے کے لئے سر اسٹیفورڈ نے اپنا مسودہ اعلان اس اپیل کے ساتھ پیش کیا تھا:۔

"شاید ابھی کچھ مشکلات درپیش ہوں گی اور وہ اس بے اعتباری کا نتیجہ ہیں جو پچھلے برسوں میں ہمارے درمیان پیدا ہو گئی ہے۔ لیکن میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ ماضی کی طرف سے منہ موڑ لیجئے، میری بلکہ ہماری دوستی اور بھروسہ کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیجئے، اور ہمیں اجازت دیجئے کہ سردست آپ کی آزادی اور

؎۱ LAST ESSAYS, CH. IV

حکومت خود اختیاری کے قیام اور تکمیل کی خاطر آپ کے ساتھ مل کر
کام کریں"+

کرپس سے بھی پہلے، انگلستان کچھ عرصے سے اس دوستی پر زور دے رہا تھا۔ گورنر جنرل کو جو دستاویز ہدایات بھیجی گئی اس میں "ہندوستان اور سلطنت متحدہ کی شراکت" کے نصب العین کو بتاکید بیان کیا گیا تھا۔ لارڈ لن لتھ گو نے اسی نصب العین سے متاثر ہو کر اپنے مقاصد جنگ کی وضاحت کی تھی (۱۷ اکتوبر ۱۹۳۹ء) ترقی کے مختلف مدارج میں اس شراکت کو نئے سرے سے ڈھالنے اور نظروں کو آنے والے مطمح نظر تک بلند کرنے کی کوششیں برابر جاری رہیں۔ ڈومینین درجہ دیئے جانے کے وعدے "بار بار دہرائے گئے" (سر سیموئل ہور، ۲۶ اکتوبر ۱۹۳۹ء) ان کی ابتدا لارڈ اروِن کے وعدے سے ہوئی تھی۔ لارڈ لن لتھ گو کی "اگست والی پیش کش" بھی اسی اصول پر تھی۔ مسودہ اعلان جس میں جنگی کابینہ کا وعدہ موجود تھا۔ اب تک اس سلسلہ میں حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ وعدہ ابھی تک ساقط نہیں ہوا ہے۔ وہ ساقط نہیں ہو سکتا۔ اس کے ساقط ہونے یا اس میں کتر بیونت کی جگہ ہرگز نہ دی جائے[1] وعدہ تو زندہ اور قائم ہے۔ لیکن باہمی اعتماد اور اعتبار میں کافی جان نہیں ہے۔ اِدھر اگر حالیہ تعلقات کی تاریخ کے متعلق ہندوستان کا نقطہ نظر برطانیہ پر بھروسہ کرنے میں مانع ہے، تو اُدھر برطانیہ نجات دہندہ اور مالک سلطنت ہونے کی متضاد روایتی حیثیتوں کی وجہ سے ہندوستان کے دعوے آزادی کی حمایت صرف ادھورے دل سے کرتا ہے۔ ہندوستان

---

[1] ۱۰ ستمبر ۱۹۴۲ء کو وزیر اعظم نے یہ اعلان کیا کہ مسودہ اعلان میں جو عام اصول پیش کئے گئے تھے وہ اپنی پوری وسعت اور صداقت کے ساتھ اب بھی "تاج برطانیہ اور پارلیمنٹ کی طے شدہ پالیسی" کی حیثیت رکھتے ہیں ۱۲

کو جو اندیشہ ہے وہ "تمارِیخ مابعد کی چک"[لہ] کے نامبارک الفاظ میں بیان کیا گیا تھا، اسی طرح سے انگلستان کا اندیشہ ویسے ہی نامبارک الفاظ یعنی "سلطنت کا ٹاٹ اُلٹنا"[لہ] سے ظاہر کیا گیا۔ قومی ریاستوں کی اصلاح کی واحد صورت ایک ایسا بین الاقوامی نظام ہے جس میں کسی قوم کی آزادی سے کوئی دوسری قوم کمزور نہ ہونے پائے۔ ضروری نہیں ہے کہ ہندوستان کی آزادی سے برطانیہ کو نقصان پہونچے، بلکہ دوسری ڈومی بہنوں کی طرح ہندوستان کی توسیع سے دولت مشترکہ کو فائدہ ہی پہونچنا چاہیئے۔ اگر "ایک کُل" کی آزادی کو اس کے اجزائے ترکیبی کی آزادی سے تقویت نہ پہونچی تو اٹلانٹک چارٹر نقش برآب ثابت ہوگا اور "چار آزادیوں" کا بھی وہی حشر ہوگا جو "چودہ نکات" کا ہوا۔

(و) بے اعتباری کا سبب

غرض کہ بے اعتباری کی وجہ سے ہندوستان اور برطانیہ، گفت و شنید ختم ہوگئی۔ لیکن بے اعتباری تو صرف علامت ہوتی ہے۔ اس کا سبب کیا ہے؟ یہ سبب آپ کو زیادہ تر اس کارروائی میں ملے گا جو سرکاری طور پر ہندو مسلم مسئلہ کے بارے میں کی گئی۔ اس مسئلہ کو جس طرح ہاتھ میں لیا گیا اس سے صحیح ہو یا غلط، یہ شبہ پیدا ہوگیا کہ برطانیہ فرقہ وارانہ مشکلات کو بہانہ بنا کر ہندوستان میں حکومت خود اختیاری کی ترقی روکنا چاہتی ہے۔ برطانیہ کی طرف سے یہ احتجاج کیا جاتا ہے :۔

لہ POST-DATE CHEQUE کرپس پیش کش کے متعلق مسٹر گاندھی کا جملہ ۱۲۔ مترجم

لہ مسٹر چرچل کے الفاظ ۱۲ مترجم

"اگر راستہ میں مشکلات پیش آئیں تو ان کی ذمہ داری ہم پر عاید نہیں ہوتی۔ یہ مشکلات اس برصغیر (SUB-CONTINENT) میں طبقوں اور فرقوں کی بے شمار تقسیموں میں مضمر ہیں" [1]

دوسری طرف سے کانگریسی ہندوستان یہ احتجاج کرتا ہے :-

"برطانوی حکومت اور اتحادی مقصد دونوں کے لیئے یہی بہتر ہوگا کہ اقلیتوں کے سوال سے زود یقین دنیا کو دھوکہ دینے کی کوشش نہ کیجائے" [2]

اس قسم کا احتجاج مسٹر جناح نے بھی دوسری راونڈ ٹیبل کانفرنس کے بعد کنگ کالج کے سنٹرل تھیٹر میں مارچ سنہ ۱۹۳۲ء میں اپنی تقریر میں کیا تھا :-

"اور بار بار ہندو مسلم سمجھوتے کے سوال کو اچھال کر صورت حالات کو اور بدتر بنایا جاتا ہے..... میں آپ سے سچے دل سے پوچھتا ہوں کہ کیا ایک ایسے مسئلہ کے متعلق ہم اس وقت تک کسی قسم کا سمجھوتا کر سکتے ہیں جبکہ اسکے پیچھے کوئی سند جواز نہ ہو یا تصفیہ کے بعد اس کی پابندی کرانے کے لیے کوئی وسیلہ موجود نہ ہو..... اور ایک مرتبہ پھر میں برطانوی پبلک سے سوال کرتا ہوں کہ جب آپ خود بجری محصول کے پریشان کن سوال کو حل نہیں کر سکتے تو ہندوستانی فرقہ وارانہ مسئلہ کا ذکر آپ کس منہ سے کرتے ہیں ؟" [3]

بجا طور پر ہو یا بے جا، جبتک ملک میں ہندو مسلم مخالفت جاری رہے گی، برطانیہ کے خلاف احساس ضرور موجود رہے گا۔ یہ ثابت کرنے کے لئے کہ برطانیہ نے فرقہ وارانہ مشکلات حل کرنے میں ہندوستان کی مدد کی ہے وہ ایک اور صرف ایک ہی ثبوت پیش کر سکتا ہے:-

---

[1] مسٹر سیموئل ہور، دارالعوام ۲۶ اکتوبر سنہ ۱۹۳۹ء [2] مسٹر گاندھی سی گاؤں ۲۶ اکتوبر سنہ ۱۹۳۹ء [3] RIFF

وہ ہم اس بارے میں اپنی نیک نیتی کا ثبوت دے چکے ہیں۔ ہم نے کمیونل اوارڈ دیکر اس کا ثبوت دے دیا۔ اگر اسوقت ہماری نیت پھوٹ ڈلوا کر فتح حاصل کرنے کی ہوتی تو ہم ہندوستانیوں سے کہہ سکتے تھے کہ :۔

"جاؤ پہلے اپنی فرقہ وارانہ مشکلات حل کرو، جب تک تم انکا تصفیہ نہ کر لوگے، کوئی دستوری ترقی نہ ہو سکے گی،، [1]

خیر جو کچھ ہوا، ہوا۔ لیکن حالیہ گاندھی جناح گفت وشنید کے ٹوٹ جانے کے بعد اب یہ بات صاف ہوگئی ہے کہ جب تک باہر سے مدد نہ ملے اور دوسرے لوگ ہندو مسلم مسئلہ کے حل میں دلچسپی نہ لیں، یہ سوال حل نہیں ہوسکتا۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ برطانیہ اپنے موجودہ منفی (بے تعلقی کا) رویہ کو زیادہ عرصہ تک جاری نہیں رکھ سکتا۔ خود اپنے فائدہ کیلئے، ہندوستان کے فائدہ کیلئے اور امن عالم کے مفاد کی خاطر برطانیہ کو اس کام میں اپنا حصّہ لینا چاہیئے، اگرچہ یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ حصّہ ایک اور فیاضانہ اور ثالثی کے اوارڈ کی شکل میں ہو۔ اگرچہ برطانیہ ہندوستان پر کوئی سمجھوتہ جبراً نہیں ٹھونس سکتا لیکن وہ سمجھوتہ کی فضا پیدا کرسکتا ہے اور اسے یہ کرنا چاہیئے بلکہ اسے خود ایک سمجھوتہ مرتب کرنے میں پہل کرنی چاہیئے۔ اخباری اطلاع کی بموجب مسٹر جارج گبسن (GEORGE GIBSON) صدر ٹریڈ یونین کانگریس نے ڈومی نیئوں اور ہندوستان کے اخباری نمائندوں کو مخاطب کرتے ہوئے حسب ذیل الفاظ کہے تھے :۔

"اگر برطانیہ نے ہندوستانی مسئلہ حل نہیں کیا تو اس کی سلطنت کا شیرازہ بکھر جائے گا برطانیہ کا فرض ہے کہ وہ صحیح حل معلوم کرنے کے بارے میں ہندوستان کی مدد کرے اور محض یہ کہکر وہ جب تک

---

[1] سر سیموئل ہور، دارالعوام، ۲۶ اکتوبر ۱۹۲۹ء۔

تم میں اتفاق نہ ہو ہم کچھ نہیں کر سکتے " ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہ بیٹھا رہے"[۱]

سر والٹر لےٹن (SIR WALTER LAYTEN) نے تو یہاں تک کہہ دیا

کہ جبتک ہندوستان میں کوئی سمجھوتہ نہو عالمی نظام قائم کرنے کا کام اگر ناممکن نہیں تو بہت زیادہ دشوار ثابت ہوگا[۲]

بعض حلقے سختی سے اِس خیال پر قائم ہیں کہ ہندوستان میں برطانیہ کی طرف سے نیک خیالی اور خیر سگالی کی جو کمی پائی جاتی ہے اِس کا ہندوستانیوں کے آپس کی عداوتوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ دراصل اِسی خیال کی وجہ سے یہ دونوں ناسور رہے ہیں اور وہ ساتھ ساتھ ہی نہیں بہتے بلکہ یہ ایک دوسرے کے اندر بہہ رہے ہیں۔ اِس صورت حال کی خصوصیت کا تقاضہ ہے کہ ان دونوں مسائل کو حل کرنے کے لئے اِن پر مِل جُل کر اور سامنے کے رُخ سے ہلّہ کیا جائے۔

"اگر ہم میں دستور اور رواج کو چھوڑ دینے کی ہمت پیدا ہو جائے تو توشاید ہم اب بھی ہندوستان میں اندرونی اتفاق واتحاد اور دولتِ مشترکہ کے اندر برطانیہ اور ہندوستان کا اتحاد حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں"[۳]

ہندوستان کے سوال کو اپنا سوال سمجھنا برطانیہ کے لئے بھی اتنا ہی مفید ہے جتنا کہ ہندوستان کے لئے۔

"ہمیں اتفاق اتحاد اور سیاسی اور ذاتی مناقشوں کو بند کر دینے کی ہر طرح تائید کرنا ہے۔ ہم نیشنلسٹوں (قوم پرستوں) سے کہتے ہیں " ان چیزوں کو چھوڑ دو اور جنگ کے زمانہ میں آپس میں مل کر مشترکہ خطرے کا مقابلہ کرو" ہم ان سے یہ کیسے امید کر سکتے ہیں کہ وہ ہماری اِس بات پر لبیک کہیں۔ آگے کا راستہ اتنا آسان

۱؎ ۔ منقولہ ہندوستان ٹائمز ۲۵۔ سٹی ہال لیکچر ۳ مارچ ۱۹۴۲ء ۲؎ ۔ ۳؎ مانچسٹر گارجین ۱۴ اکتوبر ۱۹۳۹ء

نہیں ہے جتنا کہ انگلستان کا خیال ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر ہندوستان
خود اپنے میں وہ اتحاد پیدا کر سکے جو لازمی ہے تو دنیا کی
کوئی طاقت اسے اس آزادی پانے سے محروم نہیں کر سکتی
جس کا وہ آرزومند ہے، اور ہمارا فرض ہے کہ اس کی قوت اور
اتحاد کی تشکیل میں جو کچھ ہم سے بن پڑے کریں۔ تب ہندوستان دیکھ
لیگا کہ ہمارے گروہ کے ساتھ منسلک رہنے میں خود اسی کا فائدہ ہے"[۱]

لیکن برطانیہ میں جو مسلک سیاسیات آج برسر اقتدار ہے وہ اب بھی
اس مغالطہ پر اڑا ہوا ہے کہ ہندو مسلم سوال، ہندوستانی برطانوی سوال سے بالکل
مختلف ہیں اور ایک کا دوسرے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ دونوں مسائل جس طرح
ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں اس کی طرف سے آنکھیں بند کر لینا
ہرگز مفید مطلب نہیں ہو سکتا۔ وہ گروہ جو ان دونوں مسائل کو ایک دوسرے
سے علیحدہ سمجھتا ہے یہ توقع کرتا ہے کہ ہندو مسلمان آپس میں تو غیر متحد اور غیر متفق
رہیں لیکن برطانیہ کے ساتھ اتفاق و اتحاد رکھیں۔ یہ کرتب اتنا ما بعد الطبیعاتی ہے
کہ ہندوستان باوجود اپنے مشرقی شوق تجرید کے اسے دکھا نہیں سکتا۔
علم الامراض کے قوانین کی رو سے بھی وہ ناممکن ہے۔ کسی عضویہ کے اندر اگر کوئی
زہریلا مرکز پیدا ہو جائے، تو موقع ملنے پر وہ دور تک سرایت کر جاتا ہے۔ ہیئت
سیاسیہ کا وہ زہر جو ہندوستانیوں کے آپس کے تعلقات خراب کر رہا ہے
آسانی سے پھیل جاتا ہے اور ہندوستانی برطانوی تعلقات کی جڑ تک سرایت
کر جاتا ہے۔ اس سے بحث نہیں کہ آپس کی عداوتوں کی بنا حقیقی ہے یا خیالی، بجا ہے
یا بیجا لیکن اگر وہ موجود ہے اور اپنا کام کر رہی ہے تو اس کی روک تھام ضروری

---

[۱] سرجارج شسٹر، دارالعوام، ۲۴ فروری ۱۹۴۰ء

ہو جاتی ہے۔ اگر نقطۂ نظر صحیح ہو گیا تو یہ بنا بھی خود بخود غائب ہو جائے گی۔

(ز) بعض دماغی گتھیاں اور ان کا علاج

ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں نے کسی نہ کسی طرح یہ سمجھنا شروع کر دیا کہ جو کچھ طاقت بھی ان کی طرف منتقل ہو گی وہ گویا برطانیہ کی طرف سے ایک طرح کا ہدیہ ہو گا۔ خواہ تیسرا فریق "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کے جرم کا مجرم ہو یا نہ ہو، لیکن مرکز ثقل اسی کے اندر موجود ہے اور دانستہ یا نادانستہ دونوں فریقوں میں ایک طرح کی رقابت ہو گئی ہے اور وہ تیسرے فریق کی طرف آنکھیں لگائے ہوئے ہیں کہ وہ انھی کو تسلیم کرے۔ محکوم اقوام میں جو پست اخلاقی پیدا ہو جاتی ہے وہ تو خیر ہے ہی، لیکن اس کے علاوہ ایک اور چیز بھی ہے اور وہ تیسرے فریق کی اس حیثیت میں مضمر ہے کہ بقیہ دو فریقوں پر اقتدار کی ساری ڈوریاں اس کے ہاتھ میں ہیں۔ بہر حال جو کچھ بھی ہو اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جب اکبر کی حکومت تھی اور ملک میں اتفاق کا راج تھا تو تیسرے فریق کی یہ دماغی گتھی یا ہوّا موجود نہ تھا، حالانکہ اکبر کے عہد میں اگر اس قسم کی شورش ہوتی تو اسے ہرگز گوارا نہ کیا جاتا۔

تیسرے فریق کے متعلق اس ذہنی گتھی میں ایک اور گتھی، یعنی تاریخی گتھی کی وجہ سے اور زیادہ الجھن پیدا ہو گئی ہے بعض مورخین ایک باقاعدہ پروپیگنڈا کے تحت جب کبھی مسلمانوں کے دور کا ذکر کرتے ہیں تو اسے تاریخ ہند کے "تاریک دور" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ یہ اس لئے کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کو نقصان پہنچا کر انگریزی راج کو ہندوؤں میں مقبول بنایا جائے۔ لیکن محض تاریخ کو از سر نو لکھنے سے کام نہ چلے گا۔ یہ احساس پیدا کرانے کیلئے کہ ملک میں اتفاق اور اتحاد موجود

ہے ایک ایسی تنظیم پیدا کرنی ہوگی جو سارے ملک پر حاوی ہو۔ ہر نقطہ نظر سے عوام کے ذہن پر ایک عظیم الشان تبدیلی یعنی اس احساس کا کہ اتحاد کارفرمائی ہو کر رہے گا۔ حرکت آفریں اثر پیدا کرنا ہوگا۔

اس تنظیم کا کام یہ ہوگا کہ وہ لوگوں میں اس بات کا یقین پیدا کردے کہ اب عملی کام ہوگا تاکہ ہر طرف فکر و خیال میں حرکت پیدا ہوجائے اور لوگ عملی تدبیروں پر غور کرنے لگیں۔ آج کل ہر طرف ایسی حیران کن اور مبہم گفتگو جاری ہے کہ اصل مطلب کا سمجھنا دشوار ہو رہا ہے۔ ہر گروہ اپنی شکایات کو مختلف الفاظ میں بیان کر رہا ہے، جو اکثر ایک دوسرے سے متضاد ہوتے ہیں۔ معقول اعتراضات کا جواب دینا ہی کافی نہیں ہے۔ غیر معقول اعتراضات کا جواب بھی ضروری ہے اس لئے کہ ان سے بھی فساد پیدا ہوتا ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ جب تک یہ نہ معلوم ہو جائے کہ وہ کیا بات ہے جس سے لوگوں کا رویہ اس قدر غیر معقول ہو گیا ہے، یہ مشکل حل نہ ہو سکے گی۔

غرضکہ اصل مسئلہ اب یہ ہے کہ سارے ملک میں رائے عامہ کا جائزہ لیا جائے اور ہندو مسلم سوال کی باضابطہ اور اصولی تحقیق کے لئے مواد فراہم کیا جائے۔ کام یہ ہوگا کہ رائیں معلوم کی جائیں، تبادلہ معلومات ہو، ترددات کو واضح کیا جائے، مختلف نقطہ ہائے نظر کو گوشوارہ کی شکل میں مرتب کیا جائے۔ غیر ضروری باتوں کو حذف کر دیا جائے۔ نزاعی مسائل کو حتی الوسع کم کیا جائے۔ مطالبات میں معقولیت پیدا کی جائے اور ایسے مشترکہ سمجھوتے کیے جائیں جو قابل عمل بھی ہوں۔ یہ ایک ایسا کام ہے، جس میں علاوہ ان باتوں کے جو اس مقالہ کے آخری باب میں بیان ہوئی ہیں، حکومت کو پہل کرنی چاہیے۔

کوئی شک نہیں کہ ہمارے سامنے جو سوال ہے وہ حد سے زیادہ پیچیدہ ہے

لیکن اس سوال کی روح ہندو مسلم سوال ہے یہ مسئلہ اصل میں باہمی تعلقات بالفاظ دیگر ذہنوں کا مسئلہ ہے۔ صرف سیاسی انجنیری سے دماغی مشینری نہیں چل سکتی، اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ یورپ میں اقلیتوں کے سمجھوتے کی ناکامی پر تبصرہ کرتے ہوئے، میکارٹنی نے اپنا بنیادی مفروضہ، ان الفاظ میں بیان کیا ہے:-

"اگر ذہنیت کی اصلاح ہو جائے تو (سمجھوتے کی) مشینری بہت جلد معلوم کر لی جائے گی" ما[1]

بدقسمتی سے یورپ کی ناکامی سے ہمیں ابتک یہ سبق حاصل نہیں ہوا ہے کہ جو علاج اس وقت تجویز کئے جاتے ہیں یعنی معاہدے اور فی صدی تناسب۔ وہ کتنے محدود ہیں ہمارے پاس کچھ اپنے دیسی علاج بھی موجود ہیں لیکن ہم ان کی ناقدری کرتے ہیں اور انھیں پیٹے بٹوں کا علاج کہتے ہیں لیکن یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ صوفیوں اور بھگتوں کی سوانح اور تعلیم کے اثر سے یہ دونوں فرقے نازک حالات میں ایک دوسرے کے نزدیک اور ملاپ اور محبت کے ساتھ رہے ہیں کہا جاتا ہے کہ اب زمانہ بدل گیا ہے۔ بے شک بدل گیا ہے، لیکن بنیادی اصول زمانہ کے ساتھ نہیں بدلا کرتے

خواہ ہندو مسلم تعلقات کا سوال ہو، یا ہندوستانی برطانوی تعلقات کا اسکا حل انسانوں کے ذہنوں اور دونوں فرقوں کی روحوں میں تلاش کرنا ہوگا۔ کوئی سیاسی فارمولا طلسماتی علاج ثابت نہیں ہو سکتا۔ کم از کم ہمارا تجربہ یہ ہے کہ ابتک سیاسی سمجھوتوں اور دستوری فارمولوں کے جو فوری علاج تجویز کئے گئے وہ سب کے سب ناکام رہے ہیں۔ یہ اعتراف کسی شدید کمزوری کی دلیل نہیں ہے سوال یہ ہے کہ وہ کیوں ناکام رہے ہیں؟ سر اسٹیفورڈ

---

[1] NATIONAL STATES AND NATIONAL MINORITIES P. 408

نے اس طویل داستان کو ایک جملہ کے اندر سمو دیا ہے :-

"زمانہ گزشتہ کی بے اعتباریاں اتنی شدید ہیں کہ انھوں نے زمانہ حال میں بھی سمجھوتا نہیں ہونے دیا۔"

لوگوں کو اس سے پہلے ہی سنجیدہ الفاظ میں متنبہ کیا جا چکا ہے۔" ایسی رکاوٹیں بہت کم ہیں جو خیرسگالی اور تعاون سے دور نہ ہو سکیں" یہ اس پیغام کے الفاظ ہیں جو ہز رایل ہائی نس ڈیوک آف گلاوسسٹر، ملک معظم کی طرف سے ہندوستان لائے تھے۔ اس پیغام میں آگے چل کر تاکیدًا بتایا گیا تھا کہ جملہ متعلقہ اشخاص کے سامنے جو کام ہے وہ یہ ہے کہ "بے اعتباری سے پیدا ہونے والی تمام رکاوٹوں کو دور کر دیا جائے" لیکن شاید اس وجہ سے کہ خیرسگالی کے الفاظ کو عام طور پر محض زورِ فصاحت سمجھا جاتا ہے یا پھر شاید اس وجہ سے کہ ارباب نظم و نسق کو بہت زیادہ تخیل سے کام نہ لینا چاہیئے، اس تنبیہ کے باوجود، کوئی اعتبار آفریں مشنیری پیدا کر کے کسی قسم کی خیرسگالی کی مہم شروع نہیں کی گئی۔ ایسے حالات میں اگر کرپس کی تجاویز، جن کا تصور اس قدر اعلیٰ اور شریفانہ تھا، بے حس کانون اور ان کا مشن بے نور آنکھوں پر کوئی اثر نہ کر سکا تو اس میں تعجب کی کون سی بات ہے۔ سیاسی سمجھوتا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ اس کے بغیر امن اور ترقی ناممکن ہے لیکن جب تک کلچرل (ثقافتی) مفاہمت نہ ہو یہ سمجھوتا نہیں ہو سکتا۔ جب تک دماغی پس منظر دھندلا ہے سیاسی منزل مقصود کا پرتو اس پر نہیں پڑ سکتا۔

اگر کسی اعلیٰ درجہ کے فارمولا سے کام چل سکتا تو میں پھر کہتا ہوں، سر اسٹیفورڈ کرپس کے لائے ہوئے فارمولے سے بہتر اور کوئی فارمولا نہیں

ہو سکتا تھا۔ کرپس مشن کی ناکامی سے یہ چیز واضح ہو جانی چاہیئے تھی، کہ سر دست ملک کی پہلی ضرورت یہ ہے کہ خیر سگالی اور اعتبار کے سرمایہ کو از سر نو فراہم کیا جائے۔ یہ کہنا درست نہیں ہے کہ چونکہ ہندوستانی سیاسی تربیت سے عاری ہیں اس لئے وہ مسودہ اعلان کو نہ سمجھ سکے خود یورپ کا کیا حال ہے، جہاں قومیں ایک فارمولے کے بعد دوسرا فارمولا پیش کرتی ہیں اور ناعاقبت اندیشی سے ایک جنگ کے بعد دوسری جنگ میں الجھ جاتی ہیں۔ دماغی علاج ہی اس وقت ساری دنیا کی اشد ضرورت ہے +

اگر ہم میں سمجھوتے کا جذبہ پیدا ہو جائے تو اس (سمجھوتے) کی مناسب دفعات کی ترتیب میں بھی ہمیں کامیابی ہو سکے گی۔ ہماری اصلی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ نفسیاتی مورچہ پر ایسی لڑائیاں لڑیں جن میں ہم ایک دوسرے کو جیت لیں۔ اگر یہ ہو جائے۔ یعنی شبہ مٹ جائے اور اثر قبولیت پیدا ہو جائے۔ تو کوئی فارمولا خواہ وہ کیسا ہی ناقص کیوں نہ ہو فوراً کارآمد ثابت ہوگا۔ اگر یہ نہ ہوا تو چاہے ہم قیامت تک اتفاق اور اتحاد کی اسکیمیں بناتے رہیں، ہمیں کامیابی نصیب نہ ہوگی۔ اگر سیاسی ضابطوں ہی سے کام چل سکتا تو انگلستان اور آئرلینڈ میں تو سیاسی ضابطہ بازوں کی کمی نہ تھی پھر آخر ان میں یہ الم ناک علیحدگی کیوں ہوئی؟

آئرلینڈ کے ساتھ اتحاد کی ناکامی کی بہترین اور مختصر ترین وجہ جو کوئی انگریز پیش کر سکتا ہے یہ ہے کہ افراد کی طرح قوموں کے تعلقات میں بعض غلطیاں ایسی ہو جاتی ہیں جو ناقابل تلافی ثابت ہوتی ہیں۔

مجھے امید ہے، اور میری دعا ہے کہ ہم بھی اس واقعہ سے سبق
لیں۔ کاش ہندوستان اور سلطنت متحدہ کے باہمی تعلقات میں اس
قسم کی ناقابل تلافی غلطیاں پیدا نہ ہوں ۔

نواں باب

ایک متفقہ آئین!

جب تک بنیادی طور سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں سمجھوتہ نہ ہوجائے اس وقت تک کوئی آئین نہیں بن سکتا۔ اب سمجھوتہ کن اصول پر ہوسکتا ہے:۔

(ا) مسلم لیگ یہ چاہتی ہے کہ ہندوستان کی تقسیم ہوجائے اور اس میں مسلمانوں کی اپنی اس قسم کی ریاستیں ہوں جنھیں حکومت کرنے کے پورے اختیارات حاصل ہوں۔ پاکستان کے مطالبہ کا نچوڑ یہی ہے۔ کانگریس مہاسبھا ہندوستانی عیسائیوں سکھوں۔ آزاد مسلم کانفرنس مسلم مجلس اور بعض دوسری جماعتوں نے ابھی تک پاکستان کے اُصول کو تسلیم نہیں کیا ہے۔ اگرچہ حال میں مسٹر گاندھی نے اس سے ملتی جلتی ایک پیشکش مسٹر جناح کو ضرور کی تھی۔ لیکن یہ قابل ذکر ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی ایک بہت بڑی اکثریت پاکستان چاہتی ہے۔

(ب) سر اسٹیفورڈ کرپس کے مسودۂ قانون کی سفارش یہ تھی کہ وفاق کے اصول پر یونین آف انڈیا ہونی چاہیئے۔ عبوری دور کی قومی حکومت کے فوری سوال پر کانگریس نے اس مجوزہ اسکیم کو رد کردیا۔ اور مسلم لیگ نے اسے اس لئے تسلیم نہیں

کیا کہ اِس مجوزہ اسکیم میں پاکستان کی حیثیت زیادہ تر ثانوی اور کم درجہ کی ہے ۔

(ج) کانگریس ہندوستان کے لئے ایک ایسی واحد حکومت (یونی ٹری گورنمنٹ) چاہتی ہے جس کا آئین ایک نمائندہ اور دستور ساز اسمبلی (کانسٹی ٹیوانٹ اسمبلی) تیار کرے ۔ اور اِس دستور ساز اسمبلی کی بنیاد تمام بالغوں کے رائے دینے کے حق پر ہو۔ (اگرچہ کانگریس نے اپنے تازہ ترین رزولیوشن میں صوبوں کو ایسے اختیارات دیئے جانے کے اُصول کو تسلیم کر لیا ہے جن کی آئین میں تصریح نہ ہو مسودہ قانون میں جو اُصول آئین ساز جماعت کے بنانے کے لئے پیش کیا گیا۔ اس اصول کو بھی اور دستور ساز نمائندہ اسمبلی کی اِس تدبیر کو بھی مسلم لیگ تسلیم نہیں کرتی ہے)

پاکستان!

پاکستان پر اعتراض کرنے والے ابھی تک مسلمانوں کے سامنے ایسی کوئی اور مناسب اسکیم پیش نہیں کر سکے جس سے مُسلمان مطمئن ہو جائیں۔ مسلمانوں کی ہی وہ جماعت ہے جس کو دُکھ پہونچا ہے ۔ جیسا کہ مسٹر گاندھی نے بھی تسلیم کیا ہے ۔ نو کروڑ انسانوں نے جس چیز کا پکا ارادہ کر لیا ہو۔ اُس چیز کو ٹالا نہیں جا سکتا۔ اِس وقت ہند کے ساتھ مسلمان اِن شرطوں پر سمجھوتہ کرنا چاہتا ہے ۔ کہ ہندوستان کے شمال مغرب میں بھی پاکستان ہو۔ اور ہندوستان کے شمال مشرق میں بھی پاکستان ہو۔ اور اگر حقیقت میں کوئی عملی سمجھوتہ کی کوشش ہو تو اس میں اِن شرطوں کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ اگر اِن شرطوں کے قبول کرنے میں کچھ ایسی دشواریاں ہیں جو حل نہیں ہو سکتی ہیں تو اسی کی بجائے کوئی اور صورت نکالنی اور بتانی ہو گی۔ بہت ممکن ہے کہ فرقہ پرستی کے مرض کی تشخیص میں آخری اور خطرناک علامت پاکستان ہو۔ مگر پھر بھی اس مرض کا علاج کرنا ضروری ہے ۔ اِس پر غور کیئے بغیر کہ

کس چیز نے مسلمانوں کو اس مطالبے پر مجبور کیا اور اس کی بجائے انھیں کیا دیا جا سکتا ہے؟ اس پاکستان کے مطالبے کو رد کر دینا ایک لغو فعل ہے۔

اگرچہ پاکستان کا وہ تصور کافی روشن اور واضح ہے جس کی بنیاد اس اصول پر ہے کہ اپنے سیاسی و معاشی معاملات کے خود بنانے اور سلجھانے کا اختیار ہر قوم کو ہونا چاہیئے۔ لیکن جغرافیائی لحاظ سے پاکستان کی حیثیت کافی واضح نہیں ہے۔ جہاں تک اس کام کو عملی طور پر کرنے کا سوال ہے۔ پاکستان کے علاقے کا نقشہ ابھی ٹھیک ٹھیک اور صاف صاف نہیں بن سکا۔ ابھی تک سات علاقوں کا صرف ایک نقشہ تیار ہوا ہے جس میں سر سکندر حیات خاں ایک وفاقی (فیڈرل) طرز حکومت کے تحت نہ صرف برطانوی ہند کے تمام مذہبوں اور فرقوں کے لوگوں کو بلکہ ریاستوں کو بھی شامل کرنا چاہتے تھے۔ اِس پلان کو اتنی اہمیت نہیں دی گئی۔ اور اس پر اتنا غور نہیں کیا گیا جتنا کہ چاہیئے تھا اور یہ اِس بات کو ظاہر کرتا ہے۔ کہ مسلمانوں کو اس تقسیم کے کرنے کی کتنی گہری دُھن ہے۔ مسلمانوں کو یہ احساس ہے کہ "جداگانہ انتخاب" کی حفاظتی تدبیر بھی نہ چل سکی۔ لیکن ملک کو تقسیم کر کے سمجھوتہ کر لینے کا معاملہ بھی اس وقت تک نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ پاکستان کا نقشہ سامنے موجود نہ ہو۔ پاکستان کے نقشہ پر نظر ڈالے بغیر مندرجۂ ذیل سوالات کا آسان حل نہیں مل سکتا۔

(۱) اگر اپنے سیاسی و معاشی معاملات کے خود بنانے اور سلجھانے کا اختیار سکھ قوم کے لوگ مانگیں تو ان کی حیثیت کیا ہو گی۔ اگر وہ ہندوستان میں رہنا چاہیں تو انھیں اس ملک کا کون سا علاقہ دیا جائے گا؟

(۲) کیا ہر حالت میں انبالے اور جالندھر کے علاقے پاکستان میں شامل کر لیے جائینگے؟ اگر ایسا ہوا تو کس اصول کے مطابق ہو گا؟

(۳) کیا امرت سر پاکستان میں شامل ہوگا؟

(۴) شمال مشرقی پاکستان کی سرکاری زبان کیا ہوگی؟

(۵) کیا اِن دو پاکستانی علاقوں کو آپس میں ملانے کے لئے کوئی تنگ اور طویل قطعہ زمین ہوگا۔ اور اگر ہوگا تو اِس قطعہ زمین کے بارے میں کیا تجویز ہے؟

(۶) کیا کلکتہ پاکستان سے باہر ہوگا یا پاکستان کے اندر؟

(۷) اگر شمال مغربی سرحدی صوبے کے مسلمان یہ چاہیں کہ انھیں اپنے سیاسی و معاشی معاملات کو خود بنانے اور سلجھانے کا اختیار حاصل ہو۔ اور وہ پاکستان سے باہر رہنے کا فیصلہ کریں۔ تو کیا صورت ہوگی؟

جغرافیائی پہلو سے نظر ہٹا کر اَب ایسی اور بھی زیادہ زبردست دشواریوں پر غور کرنے کی ضرورت ہے جو پاکستان کی اسکیم میں نظر آتی ہیں۔ پہلا سوال یہ ہے کہ کیا حقیقت میں ان دکھوں کی دَوا یہی ہے جن سے پیچھا چھڑانے کی تدبیر کی جارہی ہے یا دوسرے الفاظ میں کیا پاکستان کوئی ایسی عملی تدبیر بتاتا ہے جس سے اِن صوبوں میں جہاں ہندوؤں کی بہت بڑی اکثریت ہے مسلمانوں کے ساتھ انصاف کا اور مناسب سلوک ہونے کا انتظام ہو جائے گا؟ یہ بات پاکستان سے کہاں حاصل ہوسکتی ہے۔ بلکہ اس کی وجہ سے ان صوبوں کے مسلمان نہ صرف ہمیشہ کے لئے ہندو اکثریت کی حکومت کے ہاتھ میں پڑ جاتے ہیں۔ بلکہ اس فائدہ سے بھی محروم ہو جاتے ہیں جو انھیں فرقہ وار تصفیہ کے لحاظ سے حاصل ہے۔ دراصل اِس بات کی ضرورت ہے ان صوبوں میں مسلمانوں کو سنبھالا جائے تاکہ ۱۹۳۷ء سے ۱۹۳۹ء تک کانگریسی وزارتوں کے تحت بدنظمی کا سابق دور پھر نہ لوٹ آئے۔ ظاہر صورت میں تو پاکستان کی اسکیم میں اس مشکل کا حل موجود نہیں ہے۔ پاکستان دو مسلم ریاستیں تو قائم ضرور کر دیتا ہے لیکن اِس مسئلے کا حل پاکستان میں نظر نہیں آتا۔ اَب پاکستان

کے مختلف پہلوؤں کو بھی کچھ تفصیل کے ساتھ جانچیے۔

خودمختار مسلم ریاستیں

یہ کہا گیا ہے کہ ایسی خودمختار مسلم ریاستوں کے بن جانے سے جہاں ہندوؤں کی اقلیت ہو خودبخود یہ اثر ہوگا کہ ہندو صوبوں میں یا مجموعی طور پر ہندو ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ بہتر سلوک ہوگا۔ صلحنامہ ورسائی سے پہلے اور اس کے بعد یورپ میں جو اقلیتیں تھیں ان کی تاریخ سے تو اس بات کی تائید نہیں ہوتی ہے۔ کیا اپنے سیاسی و معاشی معاملات کے خود بنانے اور سلجھانے کے اصول پر عمل کرکے ہندوستان کو بلقانی ریاستوں کی طرح تقسیم کر دینے سے بہتر نتیجے نکلیں گے؟ تاریخ کے تازہ ترین واقعات کے دیکھنے سے اس سوال کا جواب قطعی طور پر نفی میں ملتا ہے اس کے علاوہ پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبے اور بلوچستان اور سندھ کی مردم شماری کے نقشوں پر سرسری نگاہ ڈالنے سے معلوم ہو جائے گا کہ مجموعی طور پر مسلمانوں کی آبادی صرف باسٹھ ۶۲ فیصدی کے قریب ہے۔ کیا یہ اتنی بڑی اکثریت ہے جس کی بنا پر علیحدگی کا سوال اٹھایا جائے؟ اور جب اقتصادی میدان میں دونوں فرقوں کی اپنی اپنی حیثیتوں پر ہم نظر ڈالتے ہیں تو بظاہر یہ اکثریت بھی بیکار نظر آتی ہے۔ اگر اس پاکستانی علاقہ میں سے ضلع انبالہ کو نکال کر کشمیر کو شامل کر لیا جائے تب بھی مسلم اکثریت اڑسٹھ فیصدی سے زیادہ نہ ہوگی۔ شمال مشرقی پاکستان میں بھی چون ۵۴ فیصدی سے زیادہ مسلم اکثریت نہیں معلوم ہوتی۔ ان دونوں پاکستانی علاقوں کے درمیان جزیرہ نمائے ہندوستان حائل ہوگا جو شمال میں سات سو میل تک چوڑا ہے۔

ہلکا سا اشارہ اس طرف کیا گیا ہے کہ جو مسلمان باقیماندہ ہندوستان میں آباد

ہیں۔ وہ اپنا وطن چھوڑ کر پاکستان میں آجائیں گے۔ یہ تجویز اتنی عجیب وغریب اور نرالی ہے کہ سنجیدگی سے اس پر غور کرنا ممکن نہیں ہے۔ اور اس پر رائے زنی کیئے بغیر اسے نظرانداز کر دینا چاہیئے۔ چنانچہ خود مسٹر جناح نے اسے مسترد کر دیا ہے۔ بعض وقت اس کی تائید میں یہ مثال پیش کی جاتی ہے کہ پہلی جنگ عظیم کے بعد ترکی اور یونان کی آبادیوں میں آپس میں تبادلہ ہوا تھا۔ لیکن اس وقت اس کو بھلا دیا جاتا ہے کہ یہ معاملہ ان یونانیوں کا تھا جو جاکر اناطولیہ میں آباد ہو گئے تھے اور ان ترکوں کا معاملہ تھا جو جاکر یونان میں آباد ہو گئے تھے۔ اور ہندو اور مسلمان صدیوں سے ہندوستان میں رہتے چلے آئے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اس تبادلے میں تقریبًا دس لاکھ یونانی اور تقریبًا پانچ لاکھ ترک ایک جگہ سے سکونت چھوڑ کر دوسری جگہ آباد ہوئے تھے۔ اور یونانیوں کو ان لوگوں کے آباد کرنے میں جو دوبارہ انکے وطن واپس آئے تھے۔ تقریبًا ایک کروڑ پونڈ صرف کرنے پڑے تھے۔ ہندوستان میں تقریبًا تین کروڑ مسلمانوں کے ایک جگہ کو چھوڑ کر دوسری جگہ آباد ہونے کا سوال ہے۔ اور وہ یہ زبردست کام ہے جسے کسی انسانی وسیلہ سے پورا نہیں کیا جا سکتا ہے۔

پاکستان کی حمایت کرنے والے یرغمال یعنی ضمانت کے طور پر آدمی کو اپنے قبضہ میں رکھنے کے اصول پر آس لگائے ہوئے ہیں۔ اور یہ اصول یہاں کام نہیں دے گا۔ اور اگر ایسا ہوا تو سیاسیات کی بنیاد تہذیب وشائستگی نہیں بلکہ وحشت وبربریت ہو جائے گی۔

پاکستان کی اقتصادیات

بہت ممکن ہے کہ جلد وہ زمانہ آجائے جب دنیا کی تجارت میں ہندوستان

اِس وجہ سے نہایت ہی اہم ملک بن جائے کہ یہاں سے کوئلہ ۔ پٹرولیم ۔ کچا لوہا ۔ کچا مینگنیز مختلف قسم کے جواہرات ۔ کچا کروم ۔ باکسائیٹ ۔ نمک ۔ میگنسائیٹ ۔ ابرق ۔ جپسم مونازائیٹ اور بھٹیوں میں استعمال ہونے والے دوسرے سخت مادے ملتے ہیں ۔

آج کل کی دُنیا میں صنعتی استعداد اور قوت کی بنیاد تین چیزوں یعنی کوئلے ۔ لوہے اور تیل کی موجودگی پر ہے ۔ اِن میں سے کوئلہ اور لوہا دو ایسے عنصر ہیں جو موجودہ فولادی زمانہ میں ملک کو صنعتی بنانے کے لیئے دراصل ضروری ہیں ۔ اِس میں شک نہیں کہ تیل کی بھی بڑی قدر و قیمت ہے لیکن تیل اِن دونوں کی نسبت بہت کم ضروری ہے ۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ (جیسا جرمنی میں ہوا ہے) کوئلہ کو بہنے والے ایندھن کی شکل میں تبدیل کر جائے ۔ لیکن کوئلہ کے بغیر گزارا نہیں ہو سکتا ۔ مجموعی مقدار کی قیمت اور تقسیم دونوں پہلوؤں سے ہندوستان میں صنعتی لحاظ سے نہایت اہم اور کانوں سے نکلنے والی چیز کوئلہ ہی ہے اور بہترین قسم کا کوئلہ اور بہت ہی زیادہ مقدار میں یعنی ۹۸ فی صدی سے بھی زیادہ بنگال ۔ بہار اور اڑیسہ کے صوبوں میں ملتا ہے ۔ اِس قسم کے کوئلہ کی سب سے بڑی بڑی کانیں جو ہر طرح کے کاموں میں اور عام طور سے استعمال ہو سکے اور خاص طور پر کھانا پکانے کے کام میں لایا جا سکے اور ریل اور سمندر کے راستوں سے لا کر دوسری جگہ پہنچایا جا سکے ۔ بہار اور اڑیسہ اور اسی سلسلہ میں شمال مشرقی بنگال میں پائی جاتی ہیں ۔ اِس کے علاوہ کوئلہ کے دوسرے علاقے سنٹرل انڈیا حیدرآباد اور مدراس ہیں جو سب پاکستان سے باہر ہیں ۔ پنجاب ۔ بلوچستان اور آسام میں کوئلہ بہت کم ہے ۔ لوہا ۔ کچا منگنیز ۔ کچا کروم ۔ سونا ۔ باکسائیٹ ۔ تانبے کا میگنسائیٹ اور ابرق جن علاقوں میں نکلتا ہے وہ سب پاکستان کی حدود کے باہر ہیں ۔ پاکستان کی حدود میں جو کچھ مل سکتا ہے وہ پیٹرولیم ہے جو ڈگبوئی ۔ بدر پور ۔ گھوڑا دھوسیاں اور چھپشہ کے علاقوں سے نکلتا ہے ۔ یہ مقامات آسام اور شمال مغربی پنجاب میں واقع ہیں ۔

ہندوستان کے ان معدنی خزانوں کا مختصر سا جائزہ لیجئے تو

یہ بات ظاہر ہے کہ یہ خزانے ہندوستان کے ان علاقوں میں جو ہندوؤں یا مسلمانوں کی اکثریت کے علاقے ہیں اس طرح بٹے ہوئے ہیں کہ اگر ہندوستان کو آبادی کے مذہبی عقائد کی بنا پر تقسیم کیا جائے تو ہندو آبادی کے حصہ کا ملک دولت مند ہوگا اور مسلم آبادی کے حصہ کا ملک نمایاں طور پر مفلس ہوگا۔ ایک بند تجارت کے نظام میں بنگال کی پاکستانی ریاست صنعتی اعتبار سے مردہ ہو جائے گی۔ آسام کی مسلمان ریاست کی اقتصادی حالت بھی اچھی نہ ہوگی۔ اس حصہ میں کوئی نمایاں معدنی[۱] دولت سوائے اس کے نہیں ہے کہ یہاں سے پیٹرولیم اور تھوڑا بہت کرومیم نکلتا ہے خواہ ہندوستان کو تقسیم کیا جائے یا نہ تقسیم کیا جائے۔ پنجاب اور مغرب کی طرف کی مسلم ریاستوں کی اقتصادیات میں تبدیلی کی ضرورت نہیں ہوگی یہ اسی حالت میں رہیں گے جو اس وقت ان کی حالت ہے یعنی دیہاتی اور زرعی زندگی ہوگی اور اقتصادی اعتبار سے ہندوستان کے باجگزار ہوں گے۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ جو حالات آج کل درپیش ہیں ان میں سندھ اور شمال مغربی سرحدی صوبے کو مرکزی حکومت کی طرف سے امداد مل رہی ہے اور بلوچستان کی تو تمام ذمہ داری ہی مرکزی حکومت پر ہے۔ ابھی تک کوئی ایسی سکیم نہیں بتائی گئی جس سے ان انتظامی علاقوں اور پنجاب کی اقتصادی حالت نہ صرف اتنی سدھر جائے کہ مرکزی حکومت کی مدد کی ضرورت نہ رہے بلکہ وہ زبردست مصارف بھی پورے ہو سکیں جن کی ایک آزاد خود مختار حکومت کو اپنی حفاظت اور دوسرے لوازمات کے پورے پورے انتظام کے لئے ضرورت ہوتی ہے اگر "اپنے سیاسی و معاشی معاملات کو خود بنانے اور سلجھانے" کے اصول کو ایک منطقی دلیل کی صورت میں پیش کر کے انبالے اور جالندھر کے علاقوں کو پاکستان کی حدود سے نکال لیا جائے تو صورت حالات اور بھی زیادہ نازک ہو جائے گی۔ دلیل کے طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ پاکستان

---

[۱] "ہندوستان کی معدنی دولت اور اس ملک کا سیاسی مستقبل" مصنفہ چارلس ایچ بہرے

INDIA'S MINERAL WEALTH AND POLITICAL FUTURE
CHARLES H. BEHRE

"اپنی اقتصادی حالت کو خود ہی سنبھال لے گا" لیکن اگر یہ دو ضلع پاکستان سے باہر نکال دیئے گئے تو کوئی اقتصادی حالت ہی نہ رہے گی جسے سنبھالا جا سکے۔ رس اور گودہ تو غیروں کو ملجائیگا اور مسلمانوں کے حصہ میں گٹھلیاں اور راول پنڈی، ملتان اور بلوچستان کے ریتلے میدان رہ جائیں گے۔ اس کے علاوہ میرے تصور میں بھی یہ بات نہیں آتی کہ کوئی سکھ اس بات پر راضی ہو جائیگا کہ امرتسر پاکستان کی حدود میں رہے۔ اس کے بعد لاہور کہاں ہوگا؟ پاکستان میں یا ہندوستان میں؟

شمال مشرقی پاکستان کی مالی حالت کو سرسری نگاہ سے جانچا جائے تو اس سے بھی زیادہ مایوس کن تصویر نظر آئے گی۔ یہاں بھی بردوان کے ضلع میں اور چوبیس پرگنوں میں ہندو اکثریت ہے اور اگر ان دونوں علاقوں کو پاکستان میں سے الگ کر دیا جائے تو پاکستان میں آبادی کا تناسب تو ضرور بڑھ جائے گا۔ لیکن اقتصادی حیثیت بہت زیادہ ابتر ہو جائے گی۔ اگر یہاں بھی "اپنے سیاسی و معاشی حالات کو خود سدھارنے اور سلجھانے کے اصول کو ایک منطقی دلیل کی صورت میں دیکھا جائے" تو آسام کو جس کی دو تہائی آبادی ہندو ہے پاکستان سے الگ کرنا ہوگا اور مسلمانوں کو شہر کلکتہ اور اس کی بندرگاہ کی سہولتوں اور اس کی تجارت اور اس کے کاروبار سے دست بردار ہونا پڑے گا۔

یہ اندیشہ درست ہے کہ ممکن ہے کہ ایک متحدہ (اکھنڈ) ہندوستان میں ہندو صنعت کاری کا غلبہ ہو لیکن جس کو یہ اندیشہ ہے وہ یہ بھی فرض کر لیتا ہے کہ موجودہ اقتصادی نظام اسی طرح رہے گا۔ اگر آیندہ زمانے میں ہندوستان میں قومی حکومت ہوئی اور ایک جماعت کی حکومت نہ ہوئی تو یہ بات لازم ہے کہ حکومت کا ہاتھ کسی نہ کسی شکل میں بے روک ٹوک سرمایہ داری کو کچل دے گا۔ اور اس صورت میں مسلمانوں کو دوسری اقلیتوں کو ہندو اکثریت کے اقتصادی غلبہ کا ڈر نہ رہے گا۔

اِس اصول میں کہ "ہر قوم کو اپنے سیاسی و معاشی معاملات کو سدھارنے اور سلجھانے کا حق ہونا چاہیے" کسی استثنا کی گنجایش نہیں ہے۔ لیکن جب اس اصول کی بنیاد "خراب سیاسیات اور اس سے بھی بدتر اقتصادیات" پر ہو تو اس اصول کی یہ حیثیت نہیں رہتی ہے۔ یہ اصول صرف یہ کہہ دینے سے قابل تسلیم نہیں ہو جاتا کہ ایسے علاقے مسلمانوں کے وطن ہیں۔ جہاں مسلم اکثریت چون ۵۴ یا باسٹھ فیصدی سے زیادہ نہیں ہے۔ اپنے آپ کو ایک حد تک دھوکا دینے میں لطف حاصل ہوتا ہے۔ لیکن اپنے آپ کو دھوکا دینے کے فعل کو اگر وقت پر روک نہ دیا جائے تو یہ فعل تباہ کن اور المناک ثابت ہو سکتا ہے۔ یہ کہنا کہ بہار کے مسلمان کا وطن بنگال ہے۔ اور تہذیب و تمدن اور نسل کے لحاظ سے اس کی قومیت وہی ہے جو چٹگاؤں کے مسلمان کی قومیت ہے اور اس کی وہ قومیت نہیں ہے۔ جو بہار کے ہندو کی قومیت ہے اور یہ کہنا کہ لکھنؤ کے مسلمان کا وطن سندھ بلوچستان شمال مغربی سرحدی صوبہ یا مغربی پنجاب ہے۔ اور یہ کہنا کہ تہذیب و تمدن اور نسل کے اعتبار سے اس کی وہی قومیت ہے جو ایک بلوچ یا سرحدی پٹھان کی قومیت ہے۔ اور اس کی وہ قومیت نہیں ہے جو صوبہ جات متحدہ کے ایک ہندو کی قومیت ہے یہ سب ایک ایسا دعویٰ ہے جو بہت لوگوں کی نظر میں ٹھیک نہیں ہوگا بلکہ مضحکہ خیز ہوگا۔

اس اصول کو تسلیم کرانے کی کوشش میں کہ "اپنے سیاسی و معاشی معاملات کو خود سدھارنے اور سلجھانے کا حق ہر قوم کو ہونا چاہئے" ایک اور دلیل پیش کی جاتی ہے جس کی بنیاد سوویٹ یونین کی ایک تازہ ترین مثال پر رکھی جاتی ہے لیکن جس اصول کو روس نے پیش کیا ہے وہ ہندوستان پر صحیح نہیں اترتا۔ روس میں مختلف فرقوں اور اقلیتوں کو ایسی رعائتیں دی گئی ہیں جن سے سوویٹ یونین کی بحیثیت مجموعی انفتیار پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے۔

مجموعی حیثیت سے اِس حکومت کی متحدہ اور واحد حیثیت بدستور قائم ہے اور اس میں کوئی فرق نہیں آیا بلکہ دوسری وفاقی (فیڈرل) حکومتوں کی طرح مرکز کو زیادہ اختیارات مل گئے " ہندوستان میں کوئی انتظامی حلقہ ایسا نہیں ہے جس کی آبادی یکساں ہو اور اس میں مختلف عناصر موجود نہوں اور جسے اس "خود ارادیت" کے اصول کے مطابق اپنے سیاسی و معاشی معاملات کو خود سدھارنے اور سلجھانے کا اختیار دیا جا سکے۔ اس کے علاوہ سوویٹ یونین کی جمہوریتوں کا جہانتک تعلق ہے انھیں اِس قسم کے "خود ارادیت" کے اصول کے مطابق اپنے معاملات کو خود سلجھانے کا حق دینا اس لئے قطعی طور پر غیر ضروری تھا کہ (۱) ان میں سے ہر ایک جمہوریت اشتراکی اقتصادی نظام رکھتی ہے اور جبتک اس جمہوریت کے اقتصادی نظام کی بالکل کایا پلٹ نہ ہوجائے اُس وقت تک وہ جمہوریت سوویٹ یونین سے باہر رہکر سرمایہ داروں کے ملکوں میں زندہ نہیں رہ سکتی ہے نیز (۲) سوویٹ یونین کی اہم ترین جماعت یعنی کمیونسٹ پارٹی ان جمہوریتوں کی سیاسی زندگی کے ہر پہلو پر نظر اور نگرانی رکھتی ہے اور کمیونسٹ پارٹی موجودہ سوویٹ یونین کے کسی حصّہ کو اس سے ٹوٹ کر الگ نہیں ہونے دیگی۔ اس لئے بجز اس صورت کے اور اس وقت تک جبتک کہ ہندوستان ایسے ہی ایک اقتصادی نظام کو قبول نہ کرلے اور اس ملک کی سیاسی زندگی ایک اچھی طرح سے منظم کمیونسٹ پارٹی کے ہاتھوں میں نہ ہو ہمیں زیادہ تر ثقافت اور تہذیب و تمدن کے ڈھالنے میں خود مختاری کلچرل (آٹانومی) کی طرف غور کرنا چاہیئے بہ نسبت اسکے کہ "خود ارادیت" یعنی اپنے سیاسی و معاشی معاملات کو خود سدھارنے اور سلجھانے کے حق کی طرف توجّہ کریں۔

پاکستان کے معاملہ میں ایک اور دشواری دفاع کا مسئلہ اور سفارتی تعلقات کی تکنیک ہے۔ اگر پاکستانی ریاستوں کو حکمرانی کے پورے اختیارات حاصل ہوں

تو پاکستان اور ہندوستان کے درمیان جو معاہدہ ہوگا وہ اس قسم کا ہوگا جیسا کہ دو آزاد وخود مختار حکومتوں کے درمیان ہوا کرتا ہے۔ یہ معاہدہ اُس قسم کے اقلیتی معاہدہ سے بالکل ہی مختلف ہوگا جیسا کہ ایک سلطنت اور اس کی اقلیتوں کے درمیان ہوا کرتا ہے۔ اس قسم کا معاہدہ اُس وقت تک تیار نہیں ہو سکتا بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اس قسم کے معاہدہ کے تیار کرنے کے لئے ذہن اُس وقت تک آمادہ نہیں ہو سکتا جب تک کہ مسلم لیگ صاف صاف الفاظ میں ہندوستان کی تقسیم کی تجویز کو اور اس تجویز کے سیاسی۔ فوجی اور اقتصادی پہلوؤں کو پیش نہ کردے۔ کیونکہ پوری طرح الگ ہو جانے کی صورت میں ان پہلوؤں کی وجہ سے ایک خاص قسم کی دشواریاں پیدا ہوں گی جو اس صورت میں پیدا نہیں ہونگی جب کہ پاکستان (انڈین فیڈریشن) وفاق ہند کا ایک حصہ ہو۔ یہ تمام ہندوستانیوں کی زندگی اور موت کا سوال ہے کہ انکے ملکی دفاع کے انتظامات جدا جدا اور بہت سے لوگوں کے ہاتھ میں بٹے ہوئے نہوں اور اتنے پیچیدہ اور اُلجھے ہوئے نہ بن جائیں کہ وہ کارگر ثابت نہوں نیز ہندوستانیوں کو یہ بھی دیکھنا ہے کہ اتنا زیادہ روپیہ انتظامات پر صرف نہو کہ یہ انتظامات جاری نہ رہ سکیں۔ یہ ضروری ہے کہ بین الاقوامی دُنیا کی نظروں میں ہندوستان کی حیثیت پوری طرح سے پکی اور استوار ہو۔ اِس مقالے کے ابتدائی حصّوں میں یہ بتا دیا گیا ہے کہ یہ مسائل بہت اہم اور نازک ہیں۔

پاکستان کے خلاف جو کچھ عرض کرنا تھا وہ ختم ہوا اب اس بحث کو ابراہام لنکن کے ان نصیحت آمیز الفاظ پر ختم کر دینا چاہیئے جنہیں اکثر دُہرایا جاتا ہے اور جو ابراہام لنکن نے اپنے ہم وطنوں سے اس وقت کہے تھے جب کہ امریکہ کی شمالی اور جنوبی ریاستوں میں جنگ ہو رہی تھی۔ ابراہام لنکن نے کہا تھا کہ

> مادی اور جسمانی طور پر ہم ایک دوسرے سے الگ نہیں ہو سکتے۔ ہم اپنے ملک کے حصّوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں لیجا سکتے اور

نہ ان دو حصوں کے درمیان ایسی دیوار کھڑی کی جاسکتی ہے جسے عبور کرنا ممکن نہ ہو۔ یہ تو ممکن ہے کہ میاں بیوی میں آپس میں طلاق ہو جائے اور دونوں ایسے اوجھل ہو جائیں کہ ایک دوسرے تک نہ پہنچ سکیں لیکن ہمارے ملک کے مختلف حصوں کے ساتھ ایسا نہیں ہو سکتا۔ ہمارے ملک کے دونوں حصے اس بات پر مجبور ہیں کہ ایک دوسرے کے سامنے رہیں اور کسی نہ کسی طرح کا آپس کا تعلق قائم رہے خواہ وہ دشمنی کا تعلق ہو یا دوستی تو کیا اس تعلق کو الگ ہونے کے بعد پہلے کی نسبت زیادہ مفید یا تسلی بخش بنایا جاسکتا ہے؟ کیا غیروں میں معاہدے ہونا اس سے زیادہ آسان ہے کہ دوست مل کر قوانین بنائیں؟ کیا غیروں کے درمیان جو معاہدے ہوتے ہیں ان پر اس سے زیادہ اچھی طرح عمل ہوتا ہے جتنا کہ ان قوانین پر جنہیں دوست مل کر بناتے ہیں؟ فرض کرو تم میں جنگ چھڑ جائے تو یہ تو ممکن نہیں ہے کہ تم ہمیشہ ہی لڑتے رہو اور جب دونوں فریق خوب نقصان اٹھالیں اور دونوں میں سے کسی کو بھی فائدہ نہ پہنچے اس وقت جنگ ختم ہو جائے تو وہی پرانے سوالات پھر تمہارے سامنے آجائیں گے کہ وہ کیا شرائط ہیں جن پر ایک دوسرے سے تعلقات قائم ہوں۔"

یہ دعوے تو نہیں ہے کہ ایک اور مندرجہ ذیل اسکیم جو پیش کی جارہی ہے بے عیب ہے یا مکمل ہے۔ لیکن اس میں میرے خیال میں یہ خوبی ضرور ہے کہ اس پر آسانی سے عمل درآمد ہو سکتا ہے اور آج کل ہندوستان کے حالات کو دیکھتے ہوئے غیر معقول بھی نہیں ہے اب ہم اپنی اس اسکیم کو سرکاری مسودہ قانون کو بنیاد قرار دیکر پیش کرتے ہیں۔

(ب) یونین آف انڈیا

۱۔ یہ یونین وفاقی (فیڈرل) اصول پر قائم ہوگی۔

۲۔ یہ یونین وفاق (فیڈریشن) میں شامل ہونے والی بہت سی چھوٹی خودمختار حکومتوں سے بنے گی۔ اور اس یونین کا ایک مرکزی مقام بھی ہوگا +

۳۔ جہاں کہیں ضرورت پڑے وہاں ان حکومتوں کی سرحدوں کو دوبارہ معین کیا جاسکتا ہے۔ یعنی موجودہ برطانوی ہند کے صوبوں کی سرحدیں تبدیلی کی جاسکتی ہے +

۴۔ شمال مغرب اور شمال مشرق کے دو صوبوں کو خاص طور پر اس لئے سرحدیں تبدیل کرکے نئی شکل دی جائے گی کہ ان صوبوں میں مسلمانوں کی کافی زیادہ اکثریت ہو جائے +

۵۔ یہ حکومتیں خودمختار رہوں گی اور اندرونی معاملات میں ان کو مکمل آزادی حاصل ہوگی +

۶۔ بیرونی معاملات میں اِن حکومتوں پر پابندی صرف انہی اختیارات کی وجہ سے عاید ہوگی جو مختلف حکومتوں نے آپس میں طے کرکے یونین کو منتقل کر دیے ہیں +

(۱) **اختیارات** ۔ مرکزی حکومت کی نگرانی اور اسکے اختیار میں مندرجہ ذیل امور ہونگے۔

دفاع ۔ ممالک خارجہ سے تعلقات۔ کرنسی۔ بندرگاہی محصول۔ نشرواشاعت۔ ہوائی سروس۔ ریلوے۔ جہازی آمدورفت اور جہازوں کا انتظام۔ تار اور ڈاک کا محکمہ۔

ایسے اختیارات بھی صوبوں کو حاصل ہوں گے جن کے متعلق تصریح نہ کی گئی ہو۔

(۲) فیڈرل اسمبلی کی ترکیب۔ وفاقی حکومت کے ایوان (فیڈرل اسمبلی) کی ترکیب میں مختلف عناصر کا تناسب حسب ذیل ہوگا۔

مسلم ——————— ۴۰ فیصدی

ہندو ——————— ۴۰ فیصدی

اچھوت ——————— ۱۰ فیصدی

باقی ماندہ آبادی جس میں ہندوستانی عیسائی
اینگلو انڈین سکھ۔ پارسی اور قبائل وغیرہ
شامل ہیں ——————— ۱۰ فیصدی

مسلمانوں کو یہ اندیشہ ہے کہ اکثریت کی حکومت میں جہاں اکثریت ہمیشہ قائم رہے گی وہاں مسلمان ہمیشہ کے لئے ہندوؤں کے تابع رہیں گے۔

مختلف عناصر کی نمایندگی کا جو تناسب تجویز کیا گیا ہے اس کی وجہ سے اکثریت کی حیثیت بدلتی رہے گی۔ اور اکثریت اس بات پر مجبور رہوگی کہ دوسری جماعتوں کے ساتھ سرگرمی سے ملکر کام کرے۔ اس ترکیب کی وجہ سے مسلمان اور ہندو کو برابر کا موقع حاصل ہوگا کہ اپنی اکثریت بنالے۔ کیونکہ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اچھوت اور دوسری جماعتیں ہمیشہ ہندوؤں کے ساتھ ہی رہیں گے۔ ۱۹۳۵ء کے قانون پر عمل ہونے کے بعد تجربہ سے یہ ثابت ہوا کہ یہ عناصر بدلتے رہتے ہیں۔ اسکے علاوہ اس تجویز میں اس بات کا بھی لحاظ ہے کہ جو اکثریت بھی ہوگی اس کا اقلیت سے اتنا کم فرق ہوگا کہ اُسے فریق مخالف کی ہمدردی اور ان کی اخلاقی تائید کا دست نگر ہونا پڑے گا ہمیشہ قائم رہنے والی اکثریت کا تو سوال ہی اٹھ گیا ہے اور اب یہ امکان بھی نہیں

رہا کہ اکثریت آئندہ اقلیت کو کچل دے گی۔

اِس تجویز سے مسلمانوں کو اچھی طرح مطمئن ہو جانا چاہئے کم ازکم اسی وجہ سے کہ اس تجویز کے تحت مسلمانوں اور ہندوؤں کو برابر کی نمائندگی حاصل ہے۔ مسٹر جناح کو بھی خاص طور پر مطمئن ہونا چاہیئے۔ مسٹر جناح نے مسٹر گاندھی کے اِس فقرے کے جواب میں کہ "میں مذاق میں یہ نہیں کہہ رہا کہ قائداعظم جناح میرے بھائی ہیں" طنزیہ انداز میں ہنس کر کہا تھا کہ صرف اتنا فرق ہے کہ بھائی گاندھی کے قبضہ میں تین ووٹ ہیں اور میرے پاس ایک ہی ووٹ ہے"۔ ہماری تجویز ہندوؤں کو اس لئے پسند ہونی چاہئے کہ اگرچہ اس میں ہندوؤں سے کسی قدر قربانی کرنے کی توقع کی گئی ہے۔ لیکن ان کے مفاد کو دراصل قربان نہیں کر دیا گیا ہے۔

(۳) دستور ساز جماعت۔ اس مسئلے میں کہ دستور کون تیار کرے وہی فرقہ وارانہ دشواریاں ہیں جن کا خود دستور کے معاملے میں درپیش ہونا ضروری ہے۔ دونوں صورتوں میں ایک ہی مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ دستور ساز جماعت میں جو فرقہ وارانہ تناسب ہوگا اسی تناسب پر دستور کی نوعیت کا انحصار ہوگا۔

کانگریس کا پلان یہ تھا کہ دستور تیار کرنے کے معاملے کو ایسی نمائندہ دستور ساز اسمبلی (کانسٹی ٹیوائنٹ اسمبلی) پر چھوڑ دیا جائے جس کی بنیاد تمام بالغوں کے رائے دے سکنے کے حق پر ہو۔ اس نمائندہ دستور ساز اسمبلی کے ترکیب دینے کے معاملہ میں کانگریس نے جداگانہ انتخاب کے اصول کو تسلیم کر لیا تھا۔ اور اس کے علاوہ یہ شرط بھی لگا دی تھی کہ ان معاملات کو جن کا تعلق اقلیت کے حقوق سے ہے اکثریت اور اقلیت کے درمیان سمجھوتے سے طے کیا جائے گا۔ اور اگر سمجھوتہ نہ ہو سکا تو ان معاملات کو ثالث کے ذریعہ طے کیا جائے گا۔ مسلم لیگ اس تجویز کے خلاف ہے۔ اور نہ مسلم لیگ ایک ایسی دستورِ ساز جماعت کے حق میں ہے جسے

صوبائی قانون ساز مجالس کے چھوٹے ایوان منتخب کریں۔ اور جس کا ذکر سرکاری مسودۂ قانون میں تھا۔ لیکن ہماری رائے میں اس طرز کی دستور ساز جماعت کی تجویز کو کچھ ترمیموں کے ساتھ قبول کر لینا چاہیئے۔ تاکہ اس طرح اس میں لیگ کے بعض معقول اور واقعی مطالبات کو شامل کیا جا سکے۔

اِن مختلف رایوں کو جن میں ایک دوسرے سے اتنا اختلاف ہے مندرجہ ذیل طریقہ سے کسی قدر ایک دوسرے کے مطابق بنایا جا سکتا ہے :-

ہم نے مسلمانوں اور ہندوؤں کے لئے ۸۰ نشستیں تجویز کی ہیں۔ ان اسّی نشستوں کو چالیس دوسرے حلقہ ہائے انتخاب سے اس طرح پُر کیا جائے کہ ہر حلقۂ انتخاب سے ایک ہندو اور ایک مسلم ممبر منتخب ہو۔ ان میں سے ہر ایک حلقہ کو پانچ سو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ ہر حصہ میں ایسے بالغ ہندوؤں اور بالغ مسلمانوں کے الگ الگ رجسٹر تیار کئے جائیں۔ جو خواندہ ہوں یا اپنا گھر رکھتے ہوں یا ٹیکس ادا کرتے ہوں۔ ہر ایک حصے میں ہندو آبادی اور مسلمان آبادی ایک ہندو اور ایک مسلمان نمائندہ منتخب کرے۔ اِس طرح ہر ایک حلقۂ انتخاب میں جداگانہ طریق انتخاب کے ذریعہ پانچ سو ہندو اور پانچ سو مسلمان منتخب ہوں گے۔ یہ ایک ہزار آدمی مخلوط طریق انتخاب کے ذریعہ ایک مسلم اور ایک ہندو ممبر منتخب کریں۔ اچھوت طبقے اور دوسری جماعتوں کے متعلق بھی ایسا ہی طریق عمل اختیار کیا جا سکتا ہے۔ اِس طریقے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا۔ کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے نمائندے مل کر ہندو اور مسلمان ممبروں کو چنیں گے۔ یہ حد بندی اور علیحدگی دور ہو جائے گی۔ اور آپس کی بدگمانی اور باہمی شبہ کا شائبہ نہ رہے گا۔ اِس طرح نیچے کے ایسے ایوانوں میں سے جو اس طرح بنے ہوں۔ دس فیصدی ارکان لے کر دستور ساز جماعت بنائی جا سکتی ہے۔

(۴) مجلس عاملہ

(الف) کابینہ میں بھی ممبروں کی تعداد کا فرقہ وارانہ تناسب وہی ہوگا جو اسمبلی میں ہوگا۔

(ب) مجلس عاملہ مجلس قانون ساز کے سامنے جوابدہ ہوگی۔

(ج) وزیراعظم باری باری ایک دفعہ ہندو اور ایک دفعہ مسلمان ہوگا

(د) نائب وزیراعظم اس صورت میں ہندو ہوگا جب وزیراعظم مسلمان ہو اور جب وزیراعظم ہندو ہو اس وقت نائب وزیراعظم مسلمان ہوگا۔

(س) اگر کمانڈر انچیف ایک غیر مسلم ہو تو وزیر دفاع مسلمان ہوگا اور اسکے برعکس اگر وزیر دفاع غیر مسلم ہو تو کمانڈر انچیف ایک مسلم ہوگا۔

(س) مجموعی ذمہ داری ایک تسلیم بات ہوگی۔ (اصول سے قطع نظر یہ کسی ایسے فیصلے کے خلاف ایک تحفظ ہوگا جس سے کسی خاص فرقے یا جماعت پر اثر پڑے۔ اور اس فیصلے کو اس جماعت یا فرقے کی رائے دریافت کئے بغیر اختیار کر لیا گیا ہو کیونکہ اس خاص فرقے کے وزیروں کے استعفے داخل کر دینے سے کابینہ ٹوٹ جائے گی)

(ش) سول سروس سول سروس میں تقرر کے سلسلے میں جہاں تک ممکن ہوگا۔ اور جہاں تک کہ کام کو اچھی طرح سے انجام دے سکنے کا سوال ہوگا۔ اسی فرقہ وارانہ تناسب کا خیال رکھا جائے گا۔ ملازمت میں ترقی کا انحصار عام طور پر اچھی کارکردگی اور مرتبہ اور مدت ملازمت کے تقدم پر ہوگا۔

(ص) عوام کے ادارے :۔ لوکل سلف گورنمنٹ کے تمام اداروں میں۔ کارپوریشن میں میونسپل کمیٹیوں میں اور اسی قسم کے مختلف بورڈوں اور کمیشنوں میں اسی تناسب کو برقرار رکھا جائے گا۔

(ض) فوجی ملازمتیں۔ ہندوستان کی معرکہ آرا فوجوں میں یہ تناسب ہوگا

مسلمان ———————— ۵۰ فیصدی

غیرمسلم ———————— ۵۰ فیصدی

(ط) تحفظات کی دفعات

اس سلسلہ میں کانگریس کے اس اعلان کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے جو سنہ ۱۹۳۳ء میں بنیادی حقوق کے متعلق اُس نے جاری کیا تھا اور پھر سنہ ۱۹۳۸ء میں اقلیتوں کے حقوق کا اعلان کیا۔ سنہ ۱۹۴۰ء میں رام گڑھ کے اجلاس میں کانگریس نے ان الفاظ میں اس کی توثیق کر دی "اس سلسلہ میں کانگریس ہمیشہ دو بنیادی اصولوں پر قائم رہی ہے۔ اور اس نے ہر قدم ان ہی اصولوں کی روشنی میں اٹھایا ہے۔ (اور وہ اصول کیا ہیں)

(۱) ہندوستان میں جس قسم کا آئین بھی اختیار کیا جائے اس میں اقلیتوں کے حقوق اور مفاد کے تحفظ کا پورا پورا انتظام ہونا چاہیئے۔

(۲) اقلیتوں کو خود فیصلہ کرنا چاہیئے کہ ان کے حقوق اور مفاد کی حفاظت کیلئے کن تحفظات کی ضرورت ہوگی۔ اکثریت کو اس بارہ میں اپنا فیصلہ نہیں دینا چاہیئے لہذا اس مسئلہ کا فیصلہ اقلیتوں کی منظوری پر منحصر ہونا چاہیئے نہ کہ اکثریت کی رائے پر"۔

سنہ ۱۹۲۸ء میں مسلم لیگ نے اپنے لئے ایک فارمولا تیار کیا جو دوسرے الفاظ میں "مسٹر جناح کے چودہ نکات" کے نام سے مشہور ہے۔ اور سنہ ۱۹۳۸ء میں کانگریس کو اپنے مطالبات کی ایک فہرست پیش کی" جو مسٹر جناح کے گیارہ نکات" کے نام سے مشہور ہے۔ ان گیارہ نکات میں واضح کر دیا گیا۔ کہ کون کون سے تحفظات چاہئیں۔ یہ تحفظات دو بڑی شقوں میں تقسیم کئے جاسکتے ہیں۔ (۱) مذہبی،

سماجی اور ثقافتی اور (ب) سیاسی اور انتظامی۔

(الف) ان کا تعلق ذیل کے امور سے ہے۔

بندے ماترم کا گیت

گائے کا مسئلہ

اذان

زبان کا مسئلہ

قومی جھنڈا

بندے ماترم کے قومی گیت میں سے قابل اعتراض حصے حذف کئے جا چکے ہیں۔ اقبال کا ترانہ بھی پڑھا جا رہا ہے۔ اس وقت تو دونوں گیتوں کو سرکاری طور پر یکجا کر دینا چاہیئے۔ اسی طرح کانگریس کے جھنڈے پر بھی مسلمانوں کے امتیازی نشان کو جگہ ملنی چاہیئے۔ گائے کی قربانی کو برداشت کر لینا چاہیئے اور فریقین کے جذبات کے احترام کی خاطر قربانی کی رسم بغیر کسی نمائش کے عمل میں آنی چاہیئے۔ اذان کے مسئلہ میں کسی قسم کی دقت نہیں پیش آنی چاہیئے۔ جناح کی فہرست میں مسجد کے سامنے باجہ کا سوال شامل نہیں ہے۔ لیکن پیرپور رپورٹ میں اس شکایت کو نمایاں جگہ دی گئی ہے۔ تاہم مسجد کے سامنے باجہ بند کر دینے پر ہندوؤں کے جلوس کو پُرامن طریقے پر گزر جانے کی اجازت ہونی چاہیئے۔

زبان کا مسئلہ بے شک بہت ٹیڑھا ہے اور اسی طرح رسم الخط کا بھی۔ لیکن بہتر ہو کہ جھگڑے کو مٹانے کے لئے مرکز میں انگریزی زبان اور رومن رسم الخط کو اختیار کر لیا جائے۔ صوبوں میں مقامی زبانوں کے استعمال کی اجازت دی جا سکتی ہے۔

(ب) ان کا تعلق ذیل کے امور سے ہوگا۔

(۱) علاقوں کی از سرِ نو تقسیم جو کسی صوبہ میں مسلم اکثریت پر اثر انداز ہو رہی ہو +

(۲) مسلمانوں کے شرعی قانون اور ان کی ثقافت کا از روئے قانون تحفظ +

(۳) مقامی اداروں اور حکومت کے ماتحت ملازمتوں میں فرقہ وار تناسب کا از روئے قانون تعین، اگر پاکستان کا مطالبہ ترک کر دیا گیا تو پہلا سوال پیدا ہی نہیں ہوگا۔ اور دوسرے کو تسلیم کر لینا چاہیئے +

بہت ممکن ہے کہ اس اثناء میں مزید شکایات پیدا ہو چکی ہوں۔ لیگ کو چاہیئے کہ ان شکایات کی ایک تازہ ترین فہرست مرتب کر دے۔ اور متنازعہ امور کو ایسی باقاعدگی کے ساتھ ترتیب دے کہ ان پر معقول طور پر تبادلۂ خیالات کیا جا سکے اور ان پر تصفیہ ممکن ہو سکے۔

(۹) تحفظات کے مؤثر ہونے کی ضمانت :۔ یہ اندیشہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ ممکن ہے آئین میں جن تحفظات کا ذکر ہے ان کو عملی جامہ نہ پہنایا جائے اور اس سلسلہ میں بڑی تشویش کا اظہار کیا جاتا ہے۔ پوچھا جاتا ہے کہ اس بات کی ضمانت کہاں ہے اور اس چیز کا کون ضامن ہے کہ ان تحفظات کو پورا کیا جائے گا؟

یورپ کے معاہدات اقلیت "بین الاقوامی واجبات کی حیثیت" رکھتے تھے اور مجلس اقوام (League of NATIONS) ان کی ضامن تھی کنیڈا کی ڈومینین میں جو تحفظات فرانسیسی اقلیت کو دیئے گئے تھے قانون ویسٹ منسٹر نے ان کی ضمانت کی تھی جہاں تک ہمارا تعلق ہے مسودہ قانون ڈرافٹ ڈکلریشن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقلیتوں کے تحفظات کی ضمانت برطانیہ اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتا ہے۔ بتایا گیا ہے کہ ہندوستان اور دولت متحدہ (UNITED KINGDOM) کے درمیان معاہدے میں "ملک معظم کی حکومت کے وعدوں کے مطابق نسلی اور مذہبی اقلیتوں کے تحفظ کی گنجائش رکھی گئی ہے"

ممکن ہے ہندوستان اگر وہ یونین آف انڈیا کی خود مختار حیثیت کو عزیز رکھتا ہے اور ایسے مکمل درجۂ مستعمرات (DOMINION STATUS) میں یقین رکھتا ہے جو تحفظات کے سلسلہ میں کسی بیرونی طاقت کی خواہ وہ دولت متحدہ ہو یا مجلس اقوام ہو یا کوئی اور طاقت ہو جگہ لے سکے تو وہ اس درجہ کو قبول کرنے سے انکار کر دے گا۔ اگر صورت حالات یہ ہو تو ہم ملک کے قانون پر اعتماد رکھیں گے اور اپنی شکایات کو رفع کرنے کے لئے عدالتِ ارکانِ اتحادیہ (کورٹ آف دی یونٹس) یا عدالت عالیہ اتحادیہ (سپریم کورٹ آف دی یونین) یا آخر میں بین الاقوامی عدالت میں اپیل کریں گے۔

(۱۰) ثقافتی تحفظات: "گیارہ نکات" میں جن ثقافتی تحفظات کا ذکر ہے ان سے زیادہ تحفظات کی اس سلسلہ میں ضرورت ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں نسلی اختلافات اتنے زیادہ نہیں ہیں جتنے کہ ثقافتی اختلافات۔ دونوں فرقوں کے نسلی عنصر میں کچھ زیادہ فرق نہیں۔ ثقافتی اختلافات بھی بہت نمایاں نہیں۔ ہندوؤں کے ساتھ صدیوں تک رہنے کی وجہ سے عام مسلمان کا درۂ خیبر کے دوسری طرف کے ملکوں سے تعلق ٹوٹ چکا ہے۔ اب ہندوستان ہی اس کی ثقافتی اور معاشرتی دنیا بنکر رہ گیا ہے۔ چنانچہ اس کی زندگی کے تانے بانے میں اختلافات اور یکسانیتوں کے ملے جلے تار پائے جاتے ہیں عملی طور پر مسلمان کو جس چیز کی فکر ہے وہ سیاسی اور انتظامی تحفظات ہیں۔ ثقافتی خود اختیاری کا کوئی ایسا زوردار مطالبہ سننے میں نہیں آتا جیساکہ ایسٹونیا کے معاہدۂ اقلیت کے ذریعہ یا سویٹ روس میں پیش کیا گیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود جو بھی ثقافتی اختلافات پائے جاتے ہیں ان کا تحفظ ضروری ہے۔ ان میں سے بعض مندرجہ ذیل ہوں گے:۔

ایمان واعتقاد کی آزادی۔	مذہبی ادارے
تعلیمی ادارے	خیراتی ادارے

ایسٹونیا کے ثقافتی خوداختیاری کے قانون کی طرز پر ارکان اتحادیۂ ہند (یونین آف انڈیا) میں اقلیتوں کے مذہبی۔ معاشرتی اور تعلیمی حقوق کی نگہداشت اور اداروں کے تحفظ اور نظم ونسق کے لئے ثقافتی کونسلیں قائم کرنا مفید ہوگا۔

(۱۱) سیاسی تحفظات:۔ اگر کوئی فرقہ کسی مسودہ قانون کے متعلق یہ سمجھتا ہے کہ وہ اس کے حقوق کے لئے نقصان دہ ہے تو اس وقت تک اس پر غور وخوض نہ کیا جائے جب تک اس فرقہ کے ممبران کی تین چوتھائی تعداد اسکے حق میں نہ ہو (مسٹر جناح کے چودہ نکات کا دوسرا نکتہ)

(۱۲) وہ تجاویز جن کا اثر سکھ فرقہ پر ہو۔ ان کی تحریک صرف پنجاب اسمبلی میں کی جائے اور وہ پیراگراف (۱۱) کے تحفظ کی پابند ہوں۔

(۱۳) جن تجاویز کا اثر پارسی فرقہ پر ہو ان کی تحریک صرف بمبئی اسمبلی میں کی جائے اور وہ پیراگراف (۱۱) کے تحفظ کی پابند ہوں۔

ارکان اتحادیۂ ہند

جہاں تک وفاقی ریاستوں کی قانون ساز مجلسوں ایگزیکوٹیو اور پبلک سروسوں میں نمائندگی کا تعلق ہے۔ مندرجۂ ذیل باتیں قابل توجہ ہیں:

(الف) اقلیتیں جداگانہ انتخابات کو برقرار رکھ سکتی ہیں لیکن مرکز میں وہ "مجلس قانون ساز" کے تحت جو طریقۂ نمائندگی تجویز کیا گیا اس پر عمل کریں۔

(ب) اقلیتیں اپنے نمائندوں کی موجودہ تعداد کو برقرار رکھیں لیکن بنگال میں یورپینوں کی تعداد کو کافی کم کیا جائے:

(ج) ارکان اتحادیہ کی سرحدوں میں ردوبدل کیا جائے لیکن اس طریقہ پر نہیں کہ اکثریت اقلیت میں تبدیل ہوجائے۔

(ل) جہاں تک ممکن ہوگا کارکردگی کو پیش نظر رکھتے ہوئے قانون ساز مجلسوں میں جو تناسب ہوگا وہی یونین آف انڈیا کی کابینہ اور پبلک سروسوں میں برقرار رکھا جائے گا۔

(س) یونین آف انڈیا کے تحت پیراگراف ۲ دفعات (۴) (۵) (۶) (۸) (۹) (۱۰) (۱۱) اور (۱۲) میں جن امور پر بحث کی گئی ہے ان کا اطلاق یونین آف انڈیا پر موقع اور مناسبت سے ہوگا۔ خاص طور پر اقلیتوں کے تحفظات کے متعلق۔

کانگریس کی مجوزہ واحد حکومت ہند

اس سے ناقابل حل مشکلات پیدا ہو جائیں گی اور اس پر بحث کرنا بیکار ہے۔

باری باری مطلق اکثریت حاصل کرنے کا ایک اور طریقہ:۔ برابر کے حصے سے زیادہ کا نہ مطالبہ کیا جا سکتا ہے۔ نہ اس سے زیادہ کسی کو دیا ہی جا سکتا ہے۔ مرکز میں برابر کا تناسب اس طرح برقرار رکھا جائیگا۔ کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو باری باری ۵۱ فیصدی کی مطلق اکثریت حاصل ہوگی۔ اس سے فوری فواید حاصل ہوں گے۔ پہلا فائدہ تو یہ ہوگا کہ ووٹ حاصل کرنے کی مہمیں ختم ہو جائیں گی جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمارے سیاسی ماہروں کی قوت اور صلاحیت بجائے ووٹ حاصل کرنے کے مخالفانہ سرگرمیوں میں صرف ہونے لگے۔ تعمیری کاموں میں صرف ہوگی۔ تعمیر قوم کا جو عظیم الشان کام در پیش ہے اس کے لئے بھی یہ چیز نہایت مفید ثابت ہوگی۔ دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ ہماری سیاسی دنیا میں انسانوں کے درمیان جو مستقل چپقلش پائی جاتی ہے۔ وہ دور ہو جائے گی ایک دوسرے کو سمجھنے کے لئے فضا زیادہ سے زیادہ سازگار ہوتی جائے گی اور مشترکہ فایدہ کے لئے متحدہ کارروائیاں عمل میں آئیں گی۔ تیسرا فائدہ یہ ہوگا کہ یہ علم ہونے کی وجہ سے کہ تھوڑے ہی عرصے کے بعد دوسری جماعت برسر اقتدار آجائیگی

اور وہ اپنا بدلہ نکال سکتی ہے۔ کسی بھی پارٹی کو نامناسب تدابیر اختیار کرنے کا موقع نہ مل سکے گا۔ اس سے ایک خرابی ضرور ہوگی کہ چھوٹی چھوٹی جماعتوں اور گروہوں کی انفرادی حیثیت ختم ہو جائے گی۔ اس کے برعکس ۴۰ : ۴۰ فیصدی کے منصوبے کے تحت ان اقلیتوں کو مختلف جماعتوں کے درمیان قوت کے توازن کو برقرار رکھنے کی قابل رشک اور اہم حیثیت حاصل ہوگی۔ کوئی انسانی منصوبہ مکمل ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ لیکن اگر یہ منصوبہ دو بڑے فرقوں ہندوؤں اور مسلمانوں میں خیالات کا اتحاد پیدا کرنے میں مدد دے سکتا ہے۔ تو اس منصوبے کے حق میں سب سے بڑی بات یہی ہے۔ اس سے ایک ایسی عظیم تبدیلی واقع ہوگی جو ہماری ہمت کو نئی قوت بخش کر ہماری ساری سیاسی جد و جہد کو ایک نیا رنگ دے گی۔ اس کامیاب اور خوشگوار فضا میں اور عظیم ذمہ داری کے احساس کے تحت یہ ناممکن ہے کہ چھوٹی اقلیتوں کے ساتھ معمولی سے معمولی بے انصافی کرنے کا کوئی خیال جگہ پا سکے۔ ایک بڑے کارنامہ سے دوسرے عظیم تر کارنامے انجام دینے کے لیے ہمت بڑھتی ہے۔

ویول پلان

ابھی موجودہ کتاب زیر طبع تھی کہ ہز ایکسلنسی وائسرائے اپنے ساتھ واپسی پر ہندوستان میں عبوری دور کے لئے حکومت کی ایک تجویز لے کر پہنچے۔ یہ تجویز "ویول پلان" کے نام سے مشہور ہے۔ "ویول پلان" میں مرکز اور صوبوں میں موجود سیاسی گتھیوں کے سلجھانے کے لئے ایک عارضی انتظام کی تجویز کے علاوہ یہ بھی درج ہے کہ سیاسی مسئلوں کے حل کرنے کے لئے کیا عملی طریقہ اختیار کیا جائے۔ ملک معظم کی حکومت کی طرف سے جو قرطاس ابیض شائع ہوا ہے اور ہندوستان کے آیندہ دستور کے متعلق وزیر ہند مسٹر ایمری نے جو تقریر کی ہے ان دونوں کا مطالعہ بھی اس پلان کے ساتھ ضروری ہے۔ ہندوستان کے مستقبل کے متعلق قرطاس ابیض کے مضمون کو اور دارالعوام میں وزیر ہند کی تقریر کے مطالب کو ہز ایکسلنسی وائسرائے نے اپنے ایک تار میں مختصراً درج کر دیا ہے جو ۱۶ر جون ۱۹۴۵ء کو مسٹر گاندھی کے نام روانہ کیا تھا۔ وہ تار درج ذیل ہے:-

"مارچ ۱۹۴۲ء کی پیشکش اب بھی مکمل شکل میں حاضر ہے۔ یہ پیش کش دو بڑے اصولوں پر مبنی ہے۔ اول یہ کہ اس معاملے میں ہندوستان کی آزادی پر کوئی بندش نہیں ہے کہ وہ اپنے مستقبل کو کیا شکل دیتا ہے۔ خواہ وہ دولت مشترکہ کا رکن بن کر رہے یا دولت مشترکہ سے باہر رہے اسے اختیار ہے۔ دوم یہ کہ یہ صورت اس دستور کے ذریعہ ہی پیدا ہو سکتی ہے جس دستور کو تمام ہندستانیوں نے ملکر بنایا ہو اور جس پر آبادی کے بڑے بڑے حصے متفق اور رضا مند ہوں"۔

ویول پلان میں جو صورت تجویز کی گئی ہے اس کو مختصراً درج ذیل کیا جاتا ہے

(۱) مرکز میں پوری طرح ہندوستانیوں کا عمل دخل ہوگا۔ یہاں تک

کہ معاملات خارجہ کا قلمدان وزارت بھی ہندوستانی وزیر کے پاس ہوگا اور مرکز میں اونچی ذات کے ہندوؤں اور مسلمانوں کی برابر تعداد ہوگی اور ایک نشست نیچ ذات کے آدمیوں کے لیے۔ ایک نشست سکھوں کے لیے اور ایک نشست کسی اور اقلیت کے آدمی کے لئے ہوگی +

(۲) صوبائی کابینہ میں ہندو اور مسلمان متحد ہوکر حکومتیں بنائیں گے +

(۳) ایسے دوسرے نکات کا بھی ذکر ہے جن کا ہندوستان کی آیندہ حیثیت پر اہم اثر پڑتا ہے۔

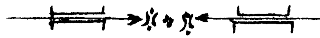
(الف) ہندوستان میں انگلستان کے ایک ہائی کمشنر کا تقرر۔

(ب) مختلف غیر ممالک میں ہندوستان کے معتمد نمایندوں کا تقرر۔

مجھے یہ دیکھ کر خاص طور پر خوشی ہوئی کہ عملی حیثیت سے یہ ساری اسکیم میں نے اس کتاب کے مختلف حصوں میں اس وقت تجویز کی صورت میں پیش کردی تھی جب کہ یہ کتاب گزشتہ دسمبر میں پہلی دفعہ شائع ہوئی تھی اگر عارضی انتظام کی حیثیت سے یہ اسکیم کامیاب ثابت ہوئی تو کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اس سے ایک نہایت مشکل مسئلے کا مستقل حل کیوں نہ ملے گا۔ اس میں شک نہیں کہ بہت سے جزئیات اور تفصیلات پر غور کرنا ضروری ہوگا۔ لیکن ایک ایسی اگزیکٹیو کونسل جسے اس ملک کی بڑی بڑی سیاسی جماعتوں کی تائید حاصل ہو یقینی طور پر ایک عارضی انتظام کے اصول پر عمل کر کے ہندوستان کے مستقبل کیلئے ایک اطمینان بخش دستور بنا سکتی ہے۔ یہی بات کہ ان مختلف جماعتوں کے نمایندے جو ابھی تک ایک دوسرے کی مخالف تھیں ملکر ایک کابینہ کی صورت میں بیٹھیں گے اور کاروبار حکومت کو چلائینگے نہایت درجہ اہم اور اطمینان بخش ہے اور اسکی وجہ سے آپس کی بدگمانیاں رفع ہوجائینگی اور معقولیت اور اعتماد کا احساس پیدا ہوجائیگا جس سے یہ امید ہے کہ ملک اور تمام دنیا کے فائدے کے لیے ایک متفقہ دستور تیار ہوسکے گا۔

دسواں باب

ہندوستانی ریاستیں



ریاستوں کے پریشان کن سوال کا سیدھا سادہ جواب یہ ہے کہ اگر ہمارا تدبر فرقہ وارانہ مسئلہ کے حل کرنے میں کامیاب ہوسکتا ہے تو ریاستوں کا مسئلہ بھی ہماری دسترس سے باہر نہیں ہوسکتا۔ بہرحال یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ قانون ۱۹۳۵ء کے وفاق کو ریاستوں نے قریب قریب مسترد کر دیا تھا۔ اب سرکاری مسودہ اعلان میں یونین آف انڈیا (اتحاد یۂ ہندوستان) کے قیام کے لئے ریاستوں کی شرکت لازمی نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ "اقتدار اعلیٰ" کے ساتھ اپنے موجودہ یا کسی قدر تبدیل شدہ رشتہ کو برقرار رکھ کر اپنے قدیم حقوق کو محفوظ رکھنا چاہیں۔ اور بلاشبہ بہت سے حقوق ہیں بھی گراں پایہ۔ لیکن یہ یقینی امر ہے کہ خواہ ریاستیں یونین میں داخل ہونا پسند کریں یا نہ پسند کریں۔ اسکی نئی جمہوریت کی روح ریاستوں میں بھی جلد اور لگاتار سرایت کرتی رہے گی یہ ممکن ہے کہ اسی نقطۂ نظر سے وہ یہ پسند کریں کہ یونین سے براہِ راست تعلق قائم کیا جائے' تاکہ ان کی حیثیت میں کم تغیر واقع ہو اور اس طرح وہ زیادہ آمادگی کے

کے ساتھ نئی روح کو اپنانے کی کوشش کریں۔ اگر وہ شریک ہوں تو انھیں (سرحدوں کے خفیف سے تغیر و تبادل کے ساتھ) آپس میں ملا کر ان کے حسب ذیل بڑے بڑے گروہ بنائے جا سکتے ہیں:۔

(۱) کشمیر اور پنجاب کی ریاستیں۔

(۲) کاٹھیاوار اور راجپوتانہ کی ریاستیں

(۳) وسط ہند کی اور مشرقی ریاستیں

(۴) میسور۔ ٹراونکور اور کوچین

(۵) حیدرآباد

یہ ماننا پڑے گا کہ اگر ریاستیں وفاق سے علیحدہ رہیں تو ان کے علاقوں کی حربی اہمیت کے پیش نظر ہندوستان کے دفاعی کو سخت صدمہ پہونچے گا۔ اس نہایت اہم بات کو ملحوظ رکھ کر ریاستوں کو اس پر آمادہ کرنا چاہیئے کہ وہ وفاقِ ہند میں داخل ہو جائیں۔ ان کی علیحدگی سے دفاعی دیواریں رخنے پڑ جائیں گے۔

وہ ریاستیں جو وفاقِ ہند میں شامل ہوں یونین کی دوسری وحدتوں کی طرح خود مختار اور آزاد ہونی چاہئیں۔ لیکن یکسانیت اور مساوات و تنار کے لحاظ سے یہ ضروری ہے کہ ان ریاستوں میں بھی جہاں تک ہو سکے ویسی ہی نمائندہ حکومتیں ہوں جیسی کہ وفاق کے باقی ارکان میں۔ عام طور پر ان ریاستوں کے فرمانرواؤں کے اقتدار پر کسی قسم کا اثر نہ پڑنا چاہیئے بجز ایسے مسائل کے جیسے کہ "صرف خاص" اور ان اختیارات کے جو وفاقی اسمبلی یا یونین حکومت کو منتقل کر دیئے جائیں۔ یہ اقتدارِ اعلیٰ حالہ قائم رہنا چاہیئے۔

گیارھواں باب

فوری اعلانات ضروری ہیں

انگلستان اور ہندوستان کے تعلقات کو نئی بنیاد پر قائم کرنے کی غرض سے اگر دیہہ مستعمرات کا فوری اعلان کر کے ایک عارضی حکومت قائم کر دی گئی اور مجلس آئین ساز کے لئے ایسے انتظامات کر دیئے گئے کہ وہ سال بھر کے اندر ہی اپنا کام ختم کر لے تو یہ صورت قطعی ناقابل عمل ہوگی۔ سردست ہندوستان میں کسی ایک جماعت کو بھی اس حد تک عام اعتماد حاصل نہیں ہے کہ وہ ایک عارضی حکومت کے فرائض سنبھال سکے اور اگر اسکا کوئی امکان ہے بھی تو بہت زیادہ نہیں ہے کہ کوئی مجلس آئین ساز خواہ کسی طرح بھی اس کی تشکیل عمل میں آئے سال بھر کے اندر کوئی مکمل آئین وضع کر سکے گی۔ ان وجوہ کی بنا پر یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ ہندوستان کے نئے آئین کے مرتب کرنے کا کام عارضی حکومت کے قیام سے پہلے ہونا چاہیے کیونکہ کسی اور صورت سے ایسی عارضی حکومت وجود میں آ ہی نہیں سکتی جسے عام اعتماد حاصل ہو ساتھ ہی انگلستان اور ہندوستان کے درمیان عہد نامہ کا خاکہ بھی اُس وقت تک نہیں بنایا جا سکتا جب تک کہ یہ پتہ نہ چلے کہ نیا

آئین کیا شکل اختیار کر رہا ہے یا یہ کہ سیاسی طاقتیں کیا رویہ اختیار کرنیوالی ہیں اور سیاسی مرکز کہاں ہو گا۔

ہندوستان کے نئے آئین میں اختیارات جس پیمانہ پہ منتقل ہوں گے اس پیمانہ پر ان کی منتقلی خود آئین سے قطع نظر ایک یا زائد ضمنی سمجھوتوں کے بغیر عمل میں نہیں آسکتی اس کی قریب ترین مثال آئرش فری اسٹیٹ (ایگریمنٹ) ایکٹ ۱۹۲۲ء کے تحت مرتب کئے ہوئے مختلف "آرڈرز اِن کونسل" میں ملتی ہے لیکن ان میں جو بحث کی گئی ہے وہ انتظامی مشنری سے متعلق مسائل سے ہے اصولی مسائل سے نہیں اصولی مسائل سے صرف نئی ہندوستانی حکومت ہی بحث کر سکے گی۔

بہر حال جس پہلو سے بھی دیکھئے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان ایک عام اعلان کر دے (وہ پہلے بھی اکثر اعلانات کرتا رہا ہے مگر بظاہر انہیں باور نہیں کیا گیا) جو کچھ اس شکل میں ہو:-

"ہم خود ہندوستان کے لئے کوئی نیا آئین وضع کرنا یا کوئی آئین اپنی طرف سے اس پر مسلط کرنا نہیں چاہتے۔ ہندوستان کے نئے آئین کے وضع کرنے کی ذمہ داری اب خود ہندوستانیوں کے سر ہے نہ کہ کسی اور پر۔ ہم ہندوستان میں اپنے اختیارات اُس نئی حکومت کو جو اس نئے آئین سے وجود میں آئے حسب ذیل شرائط کے ساتھ منتقل کرنے پر تیار ہیں۔

(۱) ہم کو اس بات کا اطمینان ہونا چاہیئے کہ وہ آئین قابلِ عمل ہے یعنی یہ کہ اسے ان لوگوں کی جنہیں اس آئین کے تحت زندگی بسر کرنا ہے عام منظوری حاصل ہے۔

(۲) ہم کو اس بات کا اطمینان ہونا چاہیئے کہ آئین کے تحت اقلیتوں کا تحفظ معقول طریقہ پر کیا گیا ہے لیکن یہاں بھی اگر آئین ان سب کے لئے جنمیں اقلیتیں بھی شامل ہیں

عام طور پر قابل قبول ہے جنھیں اس کے تحت زندگی بسر کرنا ہے تو یہ سوال پیدا ہی نہ ہوگا ہر صورت ہم یہ اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ اقلیتوں کو اپنا تحفظ خود اسی آئین ہی کے تحت تلاش کرنا ہوگا کیونکہ ہم کسی متوازی عہد نامہ کے ذریعہ ان کے لیئے اس تحفظ کی ضمانت کرنا نہیں چاہتے۔ ہم اقلیت کی کوئی جامع و مانع تعریف نہیں کرنا چاہتے اس لیئے کہ ہندوستان میں یہ اصطلاح خاصی معروف ہے لیکن ہم اسے گوارا نہیں کریں گے کہ ہر مجہول الحال گروہ اپنے کو اقلیت بنا کر پیش کرے تو اپنے مفادات کے تحفظ کا دعوے کرکے دستوری ترقی کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرے۔

(۳) ہمیں اس کا اطمینان ہونا چاہیئے کہ دستور میں کوئی ایسی بات نہیں جس سے ان ضمانتوں میں جو انگریزی حکومت نے ہندوستانی ریاستوں کو دی ہیں کمی ہوتی ہو، نیز یہ کہ جن شرائط پر ہندوستانی ریاستوں کو نئے دستور میں شامل ہونے کی دعوت دی جائے وہ منصفانہ اور معقول ہوں اور جبر کے شائبہ سے خالی ہوں۔

(۴) ہم کو اس بات کا اطمینان ہونا چاہیئے کہ تاج کے جو ملازمین ہندوستان میں ہیں اور ان نئے دستوری انتظامات کے تحت خدمات انجام دینے پر رضامند نہ ہوں ان کے حقوق کا کافی حد تک تحفظ کیا جائیگا اور ان کی باضابطہ پنشنیں اور دوسرے معاوضے انھیں یقینی طور پر ملیں گے ہمیں اس بات کا بھی اطمینان ہونا چاہیے کہ جو دوسرے قسم کے حقوق خواہ تاج کی خدمات کے صلہ میں یا کسی اور بنا پر افراد کو پہلے حاصل تھے وہ انھیں اب بھی حاصل رہیں گے اور عدالتوں یا دوسرے غیر جانبدار ٹریونل کے تشخیص کیئے ہوئے پورے پورے معاوضے ادا کیئے بغیر وہ ان حقوق سے محروم نہ کیئے جائیں گے۔

اگر یہ شرطیں پوری ہوجائیں تو نئے دستور کے نفاذ کے بعد ایک معینہ مدت کے اندر ایک تاریخ مقرر کردی جائے گی کہ اس تاریخ سے ہر قسم کی جملہ ذمہ داریاں نئی حکومت کو منتقل ہوجائیں گی۔ ہوسکتا ہے کہ بعض ایسے کم اہمیت والے امور ہوں جنھیں کسی نہ کسی قسم کے متوازی سمجھوتہ کے ذریعہ طے کرنا پڑے جیسا کہ پچھلے فقرہ میں بتایا

جا چکا ہے۔ لہذا اس امکان کا ذکر کر دینا بھی مناسب ہو گا تاکہ بعد میں بدنیتی کا الزام عائد نہ ہو لیکن ان شرائط کے ساتھ اس بات کا اعلان کر دیا جائے کہ ذمہ داریوں کی منتقلی مکمل اور قطعی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس لحاظ سے کہ آیا نئے آئین سے ہندوستان آزاد ہو جاتا ہے یا جیسا کہ برطانی دولت عامہ کے دوسرے ارکان کا حال ہے۔ تاج کے ساتھ اسکا رشتہ اطاعت بدستور قائم رہتا ہے منتقلی کا عمل درآمد مختلف ہو گا لیکن یہ سوال بڑی حد تک نظام کار سے متعلق ہے۔

آخر میں جب ان امور کی تکمیل کی تاریخیں مقرر ہو چکیں تو انگلستان ہندوستان سے اسکا اظہار کر سکتا ہے کہ وہ نئی ہندوستانی حکومت سے اگر وہ چاہے ایک تجارتی معاہدہ اور ایک امور دفاع سے متعلق معاہدہ پر تبادلہ خیال کرنا پسند کرے گا یہ سوال کہ اگر نئی ہندوستانی حکومت جواب میں یہ کہے کہ اسے اس طرح کی بات چیت کرنے کی کوئی خواہش نہیں ہے تو اس صورت میں انگلستان کیا کارروائی کرے آئندہ غور کرنے کے لئے چھوڑ دیا جائے

یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے مذکورہ بالا تجاویز میں جس پالیسی کا خاکہ پیش کیا گیا ہے اس کی نوعیت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ وہ غیر تعمیری اور بے نتیجہ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ بظاہر ایسا ہی معلوم ہو لیکن ذرا سے غور و فکر سے یہ ظاہر ہو جائے گا کہ یہ اعتراض کچھ وزن نہیں رکھتا۔ کوئی بھی یہ نہیں خیال کرتا کہ اتنی پشتوں کے تعلق کے بعد انگلستان ایک جنبش قلم سے یا کسی قسم کے اعلان کے ذریعہ اپنے آپ کو ہندوستان کے معاملات سے پوری طرح بے تعلق کر سکتا ہے اور نہ یہی خیال کیا جاتا ہے کہ ہندوستان کے زیادہ صائب الرائے طبقے اس قدر اچانک اور مکمل طور پر قطع تعلق پسند کرینگے لیکن بظاہر دو باتیں ایسی ہیں جن کا پورا ہونا دوسری تمام باتوں سے زیادہ ضروری ہے، ایک تو یہ کہ ہندوستان کے کسی طبقہ کو اسکا موقع نہ دیا جائے کہ وہ یہ کہہ سکے کہ

حکومت برطانیہ نیک نیت نہیں ہے اور دوسرے یہ کہ ہم ہندوستانیوں کو اس پر مجبور کیا جائے کہ ہم خود ہی اپنے مسائل کا سامنا کریں اور ان کے حل کرنے کی ذمہ داری لیں۔ یہ دونوں باتیں ایک لحاظ سے ایک ہی مسئلہ کے دو پہلو ہیں۔ کیونکہ اگر ہندوستان کو اس پر مجبور کیا جائے گا کہ اپنے مسائل کے تصفیہ کرنے کی ساری ذمہ داری خود ہی اپنے سرلے تو پھر کوئی شخص یہ نہ کہہ سکے گا کہ انگلستان ہی انھیں ان مسائل کے تصفیہ کرنے سے روکتا ہے ان دو معاہدوں یا سمجھوتوں کی مجوزہ پیش کش کے متعلق بھی یہی کہا جا سکتا ہے یہ کہیں زیادہ اچھا ہے کہ بجائے اسکے کہ انگلستان ایک مرتب شدہ معاہدہ پیش کرے اور ہندوستان کو اس پر دستخط کرنے کی دعوت دے ان معاہدوں کے مطالب کے متعلق تجاویز نئی ہندوستانی حکومت ہی کی طرف سے جب اس کی تشکیل عمل میں آجائے پیش ہوں۔ ملک معظم کی حکومت یا حکومت ہند یہ بھی کرسکتی ہے کہ مثلاً ایک عام اعلان کے ذریعہ اپنی اس خواہش کا اظہار کر دے کہ آئینی تبادلہ خیال کا سلسلہ شروع کر دیا جائے۔ نیز یہ کہ تجربہ بتاتا ہے کہ یہ کتنا اچھا ہے کہ بہرصورت ابتدائی منزلوں میں ایک چھوٹی جماعت ہی اس مسئلہ کی چھان بین کرے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی کہ حکومت اس پر تیار ہے کہ وہ ان لوگوں کے ملنے کے لئے ایک جگہ متعین کر دے اور ضروری عملہ اور دوسری سہولتیں مہیا کر دے۔ نیز یہ کہ وہ اس طرح کی مجلس میں حصہ لینے کے لئے خود کسی کو دعوت دینا نہیں چاہتی بلکہ اس کی تجویز ہے کہ ان لوگوں کا انتخاب صراحت کردہ مختلف جماعتیں یا ادارے ایک معینہ تعداد کے اندر کرینگے اور یہ کہ منتخب شدہ اشخاص کے لئے یہ ممکن ہونا چاہئے کہ اگر وہ چاہیں تو مزید اشخاص کی ایک مختصر تعداد کا الحاق کرلیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ زائد اشخاص ایسے ہوں جن کا کسی خاص

جماعت یا پارٹی سے تعلق نہ ہو بلکہ اس آزاد مسلک کے ہوں جو پارلیمنٹ کی غیر جانبدار نشستوں کی طرف منسوب ہے۔ اس اعلان میں یہ بھی تجویز کیا جا سکتا ہے کہ یہ سب تبادلہ خیال نجی طور پر ہو اور بالکل رازدارانہ خیال کیا جائے۔ البتہ اگر مناسب خیال کیا جائے تو یہ ہو سکتا ہے کہ کارروائیوں کی عارضی رپورٹیں مل جایا کریں۔ یہ بھی اپنی جگہ واضح ہو گا کہ سارے کے سارے آئینی مسئلہ پر تبادلہ خیال ہو سکے گا اور اس مجلس کا کوئی فرد محض بحث و مباحثہ میں حصہ لینے ہی سے اپنے کو یا اپنی جماعت کو کسی خاص پالیسی کا پابند نہ کرے گا۔ اس تبادلہ خیال کا مقصد محض چھان بین ہو گا تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ تمام مسئلوں میں کس حد تک اتفاق ہے اور یہ بھی (جو کچھ کم اہم نہیں) کہ کہاں رایوں میں اختلاف ہے۔ اگر حکومت برطانیہ سے واضح طور پر مزید امداد طلب کی گئی تو یقیناً وہ بخوشی دے گی لیکن یہ اچھی طرح واضح ہو گا کہ وہ بغیر طلب کئے کسی قسم کی امداد یا رائے نہ دے گی۔

یہ امکان بھی پیش نظر رہنا چاہئے کہ خواہ تبادلہ خیال کی اس نوعیت پر کتنا ہی زور کیوں نہ دیا جائے کہ اس کی غرض محض چھان بین کرنا ہے اور یہ کہ کسی خاص پارٹی یا جماعت کی پالیسی پر اس کا کوئی اثر مطلق نہیں پڑتا پھر بھی زیادہ بڑی پارٹیوں یا جماعتوں میں سے ایک نہ ایک اس تبادلہ خیال میں حصہ لینے پر رضا مند نہ ہو گی۔ اگر ایسا ہوا تو یہ بات یقیناً بڑی افسوسناک ہو گی لیکن اس کی کوئی وجہ نہیں کہ دوسرے لوگ اگر آنا چاہیں تو محض اسی وجہ سے شرکت نہ کریں۔ ہو سکتا ہے کہ خود انکار کرنے والی پارٹیاں یا جماعتیں بھی بعد میں شریک ہونے پر تیار ہو جائیں۔ یہ بھی پیش نظر رہے کہ شاید دو جماعتیں تبادلہ خیال کے لئے جمع ہوں اور ہر ایک اپنی اسکیم کے پیش کرنے میں لگا رہے۔ اس کے مقابلہ میں دوسری طرف شاید ابتدا ہی میں یہ بات خود حکومت برطانیہ کی

طرف سے واضح کر دی جائے کہ گو حکومت خود اس بارے میں اپنی کوئی رائے ظاہر کرنا نہیں چاہتی اور اس کے متعلق یہ سمجھا بھی نہ جائے کہ وہ اِس پالیسی یا اُس پالیسی کی حامی ہے، تاہم اسے کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ ایک جماعت جو آئینی مسائل پر تبادلہ خیال کر رہی ہے وہ ہندوستان کے تقسیم یا متحد ہونے کے امکان پر کیوں بحث نہیں کر سکتی۔ نیز یہ کہ جب ساری اسکیم کا مقصد یہ ہے کہ ایسے لوگ جو اس کے اہل ہیں آئینی مسئلہ کے ہر پہلو پر غور کر کے اُسے صحیح طور پر سمجھ سکیں تو اس قسم کے تبادلہ خیال کو لازمی طور پر خارج از بحث نہ سمجھ لینا چاہیئے۔

اس میں شک نہیں کہ اگر آئین بنانے والوں کی یہ مختصر سی جماعت کسی کم و بیش متفقہ نتیجہ پر پہونچی تو اس آئین کے مسودہ کو کسی ایسی زیادہ بڑی جماعت کے سامنے پیش کرنا ہوگا جسے زیادہ قریبی نمائندگی حاصل ہو اور جو اس کتاب کی ابتدائی فصل میں بتجویز کی گئی ہے۔ لیکن یہ بہت بعد کی بات ہے اور اس پر یہاں بحث کی ضرورت نہیں۔

بہر حال یہ ابتدا ہی میں واضح کر دیا جائے کہ اسی قسم کی کوئی چیز پیش نظر ہے۔ نیز یہ کہ جس مختصر جماعت کا اوپر ذکر کیا گیا ہے وہ صرف ابتدائی کام ہی کے لئے ہوگی۔ لیکن اگر وہ جماعت اپنا کام بحسن و خوبی انجام دے تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بڑی جماعت کی نظر ثانی محض ضابطہ کی پابندی سے زیادہ کچھ نہ ہو

"اعمال نامہ"

سر سید رضا علی ایم، ایل، اے کی خود نوشت سوانح حیات

ہندستان کے ہر ادبی ادارے کے ترجمان نے اس کتاب کو ۱۹۴۴ء کی بہترین تصنیف مانا ہے، اس میں نہ صرف سر سید رضا علی نے اپنے حالات لکھے ہیں بلکہ یہ ہندستان کی سو سالہ تاریخ کہی جا سکتی ہے۔ سیاست، شعرو شاعری، اخلاقیات، تنقید، معلومات، غرضکہ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں چھوڑا گیا جس پر سر سید رضا علی نے روشنی نہ ڈالی ہو۔ زبان و بیان کی مثال موجودہ دور میں ہرگز ہرگز کہیں نہیں مل سکتی یہ صرف سوانح حیات نہیں ہے بلکہ اب سے سو سال کی ہندستانی زندگی کی بے نقاب تصویر ہے۔ جس کے پڑھنے کے بعد کوئی بھی کتاب نظر دل اور دماغ کے لئے نیا پیام نہیں دیتی۔

قیمت مجلد آٹھ روپئے

"نگارستان ایجنسی اردو بازار دلی"

کتب خانہ جامعہ عثمانیہ

۱- اراکین مجلس اعلیٰ، مجلس رفقاء، مجلس انتظامی، مجالس شعبہ جات و نصاب پانچ کتابیں ایک ماہ تک اپنے پاس رکھ سکیں گے۔ اور گریجویٹ عہدہ داران جامعہ

۲- اساتذہ جامعہ عثمانیہ و کلیہ جات ملحقہ دس کتابیں ایک ماہ تک اپنے پاس رکھ سکیں گے۔ اور انڈر گریجویٹ

اور اراکین دارالترجمہ ترجمہ شدہ دو کتابیں بی اے و تحقیقاتی جماعتوں کے

۳- طلبائے ایم اے، ایل ایل بی ... اپنے پاس رکھ سکیں گے۔

کے طلبہ تین کتابیں ایک ہفتہ تک اپنے پاس رکھ سکیں گے اور طلبہ سے بحساب

طلبہ پانچ کتابیں دو ہفتہ تک ... واپس نہ ہوں تو ... کی غرض سے

۴- مدت مقررہ پر کتابیں واپس نہ ہوں تو فی کتاب ... لیا جائیگا۔

ایک آنہ یومیہ فی کتاب ... جاری کی جا سکیں گی مگر اس غرض

۵- بشرط موقع کتابیں گھر ... کتاب کا لانا لازم ہے۔

یہ کتب جاری ... ہو جائیں تو ... داری

۶- کتابوں پر کسی قسم کا نشان ... لگایا جائے۔

عائد ہوگی۔

۷- قلمی نسخے اور حوالے کی کتابیں جاری نہ کی جا سکیں گی۔ فقط